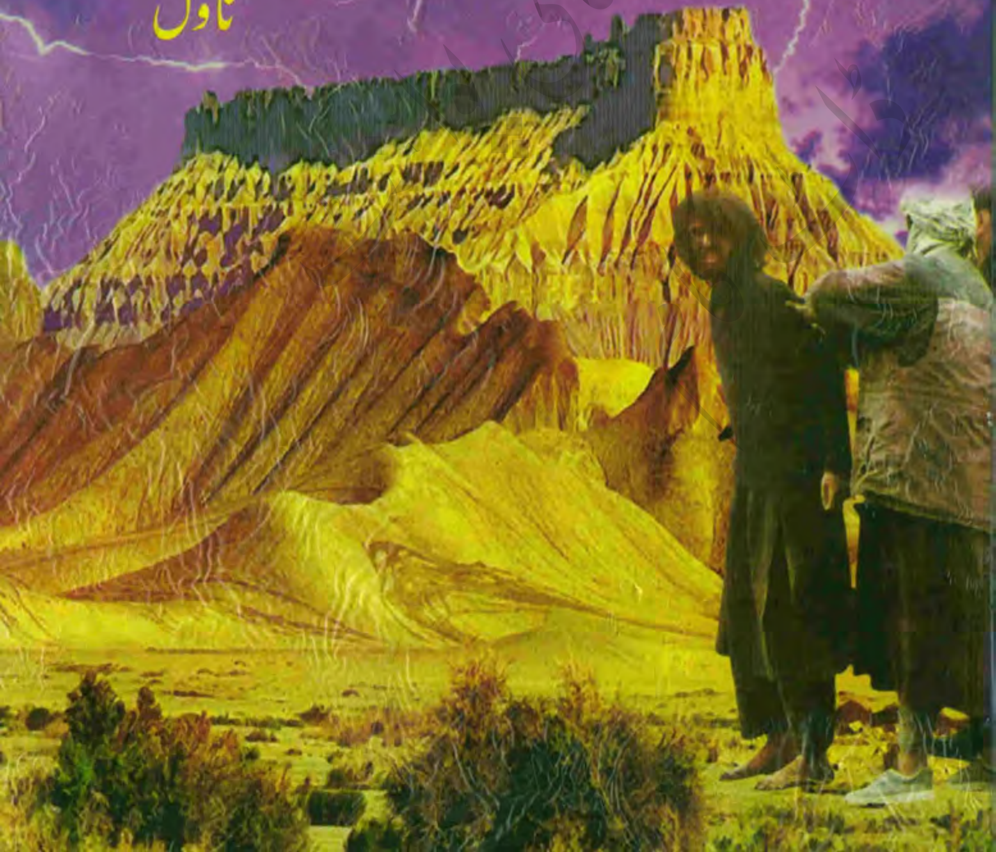
مُستنصر حسین تارڑ

# قلعہ جنگی

ناول



# قلعہ جنگی

ناول

مُستنصر حسین تارڑ

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

"گھوڑا ہے.."

"کہاں؟"

"اوپر... قلعہ جنگی کے صحن میں.."

"وہاں گھوڑا کیسے ہو سکتا ہے.. لاشوں کو کھانے آیا ہے؟"

"نہیں.. ہے.. سچ مچ کا گھوڑا ہے.. کان لگا کر سُنو.."

تہہ خانے میں اُترتی پہلی تین سیڑھیوں پر چاندنی بچھی تھی.. اُن سب کی نظریں اُن تین سیڑھیوں تک اُٹھی ہوئی تھیں..

"اوپر کوئی نہیں.."

"ہے... میں نے خود سنا ہے.."

وہ کان لگائے اتنی دیر منتظر رہے کہ اونگھنے لگے اور پھر ایک مدھم سی ہنہناہٹ تہہ خانے کی سینتیس سیڑھیاں اُترتی اُن کے کانوں تک آئی اور آتے آتے مزید مدھم ہو گئی..

"میں نے کہا تھا ناں کہ ہے.. سنو.. اگر ہم اسے پکڑ لیں تو.. کھا سکتے ہیں.."

"کس کو؟"

"گھوڑے کو.."

”اگر یہ گھوڑا ہے تو..“

”اگر یہ گھوڑا نہیں گدھا ہے تو یہ کیسے ہنہنا سکتا ہے بیو قوف.. گھوڑا ہے اور اگر ہم اسے قابو کر کے تہہ خانے میں لے آئیں تو اسے کھا سکتے ہیں“

”گھوڑا حلال ہوتا ہے؟“

”اگر نہیں بھی ہوتا تو کیا تم نہیں کھاؤ گے..“

”کھاؤں گا...“

”تم بتاؤ عبدالوہاب خادمین حرمین شریفین.. تم سے بہتر حلال اور حرام کی تمیز کسے ہو سکتی ہے ہم تو تمہارے پیروکار ہیں..“

”مکروہ ہے.. لیکن حرام نہیں.. کھایا جا سکتا ہے“

”مجھے بھوک نہیں.. پیاس لگی ہے“

”تو اللہ بخش تم جاؤ اپنی نانی جان رحمت بی بی کے پاس اگر تمہیں پیاس تنگ کرتی ہے تو..“

”نہیں بھائی مرتضیٰ اب یہ حربہ کام نہیں کرتا.. میں اتنی بار خیال ہی خیال میں اپنی نانی جان کے پاس گیا ہوں کہ گرمیوں کے روزے ہیں پیاس سے میرا جُثہ کیکر کا کانٹا ہو رہا ہے اور وہ دَوری میں چھلکے اُتارے بادام گھوٹ رہی ہیں.. پھر اُن میں دودھ ملاتی ہیں اور ابھی سورج سر پر ہے اور وہ کہتی ہیں اللہ بخش پُتّر تو ابھی بال ہے.. تیرا روزہ آدھا ہے اس لیے کھول لے.. میں تانبے کا بھاری گلاس منہ سے لگا کر وہ دودھیا گاڑھا دودھ غٹ غٹ پی جاتا ہوں اور میرا حلق ٹھنڈا ٹھار ہو جاتا ہے.. پر اب یہ حربہ بیکار ہو گیا ہے.. کام نہیں کرتا.. پہلے خیال ہی خیال میں پیاس بجھ جاتی تھی اور میں اس نامراد تہہ خانے میں بھوکا پیاسا نانی جان کے ہاتھوں کا بنایا ہوا دودھ اپنے حلق میں اترتا محسوس کر لیتا تھا.. لیکن اب نہیں.. میرا جُثہ کیکر کے کانٹوں سے بھرا رہتا ہے.. پیاس مجھے خشک کرتی ہے..“



”یہ پیاس بھی بجھ سکتی ہے“

”کیسے بھائی مرتضیٰ؟“

”گھوڑے کا خون بھی تو پیا جا سکتا ہے..“

”خون تو حرام ہوتا ہے...“

”نہیں پیو گے؟“

”پیوں گا..“

”تو پھر گھوڑے کو پکڑو... آؤ ہاشم میر...“

”مجھ میں سکت نہیں مرتضیٰ بیگ.. میرا بازو بہت سوج گیا ہے.. اس میں ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کی کرچیاں ہیں اور وہ.. ذرا سا بھی حرکت کرتا ہوں تو میرے گوشت میں کھبتی چیخیں نکال دیتی ہیں.. ہلا نہیں جاتا..“

”تم تو وہ کیا کہتے ہیں غیور پٹھان ہو گل شیر ولی... تمہارے سامنے ایک گھوڑا کیا شے ہے خاناں.. آؤ..“

”تم پر تو دل اور جان قربان کر دیں مرتضیٰ.. پر کیا کریں جان بہت اذیت میں پڑا ہے.. اُس مادر چود ڈیزی کٹر بم کا زہر آلود لوہا میرے معدے کے آس پاس جا کر کہیں ٹھہر گیا ہے اور میرے پاخانے کا نکاس نہیں ہو رہا یارا.. اور میں پچھلے تین دن سے وہ سب کچھ اپنے اندر لیے بیٹھا ہوں جو باہر آنا ہوتا ہے اور وہ نہیں آرہا.. غلاظت کو سنبھالے بیٹھا ہوں یارا.. باقی زخم وخم کا تو خیر ہے پر یہ عجیب خانہ خراب مصیبت لگا ہے.. گھوڑا کھائے گا تو اور بوجھ پڑے گا لیکن چلے گا تمہارے ساتھ..“

”جانی...“

جانی کراہ رہا تھا اور امریکی لہجے میں کراہ رہا تھا..

”عبدالحمید جان واکر... تمہیں بھی آنا ہو گا..“

"میں.. گھوڑے کو.. کسی بھی گھوڑے کو.. مار نہیں سکتا.."

"اسے پکڑنا ہے اوپر جا کر.. وہ قلعہ جنگی کے کچے صحن کی چاندنی میں کہیں ہنہنایا تھا.."

"پکڑنے کے بعد تو مارنا ہے.. آئی کینانٹ کِل اے ہارس.. نو میٹر وہاٹ.. آئی کینانٹ.. سوری!"

"تمہارا خیال ہے میں گھوڑے کو اپنے لیے پکڑنا چاہتا ہوں ڈیم اِٹ.." مرتضیٰ نے اپنی مردہ نقاہت میں سے چیخ کر کہا "مجھے گھوڑے پکڑنے کا شوق ہے؟.. بھوک اور پیاس کی اور ادھڑے ہوئے.. اور ڈیزی کٹر اور بنکر بسٹرز کی آہنی کرچیوں سے ادھڑے ہوئے بدنوں کی تین راتیں اور تین دن بہت ہوتے ہیں.. لاشوں میں بدل جانے کے لیے.. اور اگر ہم ڈھیٹ ہو چکے ہیں مرنے سے انکاری ہو رہے ہیں تو ہمیں زندہ رہنے کے لیے اس گھوڑے کو پکڑنا ہو گا.. ہم سب کو اوپر جانا ہو گا.. کیا تم سُنتے ہو؟.. ہم سب کو.. یہ سینتیس سیڑھیاں چڑھ کر قلعہ جنگی کے نامراد کچے کمپاؤنڈ میں جانا ہو گا.."

"کیا پتہ وہ وہاں ہو...."

"نہیں ابو طالب چی چی.. وہاں کوئی بھی نہیں.. اُن کے لیے ہم سب مر چکے ہیں اگر اُنہیں ذرّہ برابر بھی شک ہوتا کہ ہم ابھی تک یہاں سانس لے رہے ہیں تو وہ ہمیں کب کا فنا کر چکے ہوتے.. اوپر اُس وسیع کچے میدان میں سوائے سینکڑوں لاشوں کے اور چاندنی کے.. اور کچھ نہیں.. اوپر ان سینتیس سیڑھیوں کے اوپر قلعہ جنگی کی پستہ قد کچی فصیلوں میں گھرے صحن میں کوئی نہیں.. صحن کی مٹی میں لتھڑی ہوئی کچھ سر بریدہ کچھ سر سلامت سینکڑوں.. چاندنی میں نہائی.. لاشوں کے سوا اور کوئی نہیں.. اُن کا غسّال چاند ہے.. تو ابو طالب اُس اوپن ایئر قبرستان میں کون آئے گا.."



"بھائی جی.." اللہ بخش نے منہ کھول کر پہلے "آہو" کہا اور پھر بولا "آج جمعرات تو نہیں.."

"اخی.." عبدالوہاب ال غامدی کے ہنسنے کی آواز آئی "اس تہہ خانے میں تو رات ہی رات ہے.. تو پھر جمعرات بھی ہو سکتی ہے.. اللہ بخش اگر آج جمعرات ہو تو کیا ہو.."

"بس عربی بھائی جی خیال ہی خیال میں میرے ذہن میں خیال آ گیا کہ ہمارے گاؤں کے قبرستان میں.. بڑے جوہڑ کے پار چوہدری منور کے مالٹے کے باغوں کے برابر میں جو قبرستان ہے جاٹ برادری کا.. جہاں کمی کمین ہم جیسا مر جائے تو اُس کی قبر کناروں پر بنتی ہے اور چوہدری لوگ درمیان میں دفن ہوتے ہیں وہاں سروٹوں سے پرے.. ویرانے میں.. جہاں صرف سانپ‘ نیولے اور چرسی رہتے ہیں وہاں ہر جمعرات کو ہر دوسری قبر پر دیئے جلتے ہیں.. موم بتیاں اور اگر بتیاں روشنی کرتی ہیں.. تو یہ نہ ہو کہ آج جمعرات ہو اور اوپر قلعہ جنگی کے ویہڑے میں پڑی لاشوں کے قبرستان میں دیئے جلتے ہوں‘ موم بتیاں روشن ہوں اور ہم باہر نکلیں تو پہچانے جائیں پکڑے جائیں"

"دیئے جلانے کون آئے گا بیوقوف.." مرتضیٰ کا لہجہ بے حد درشت تھا "مردوں اور لاشوں میں فرق ہوتا ہے اللہ بخش.. مُردوں کو اعزاز ملتا ہے کفن اور کافور کا.. نہلائی دھلائی اور فاتحہ کا.. کندھوں پر اُٹھائے جانے.. کلمۂ شہادت.. آہ وزاری اور بین کا.. اور ایک قبر ملتی ہے اور بندِ کفن کھول کر اُن کا چہرہ کعبے کی جانب کیا جاتا ہے مٹی ڈالنے سے پہلے.. تو ایسے مردوں کے سرہانے جمعراتوں کو چراغ جلتے ہیں.. ہمارے اوپر قلعہ جنگی کے ٹیلے پر جو سینکڑوں لاشیں پڑی ہیں انہیں صرف چاندنی ڈھکتی ہے اور اُن کے چہرے.. کچھ تو الگ ہو چکے ہیں اور جو ابھی تک جُڑے ہوئے ہیں اُن کا منہ کعبے شریف کی جانب نہیں ہے.. تو ایسی

لاوارث لاشوں کی کوئی جمعرات نہیں ہوتی.."

"اگر ہوتی تو بھی ہم دیئے جلانے والوں میں سے نہیں ہیں.."

عبدالوہاب کی ناگوار آواز آئی.. "یہ شرک ہے... جو مر گیا سو مر گیا.. چاہے وہ فاطمہ ہو یا عثمان.."

"گھوڑا چلا جائے گا"

تہہ خانے میں سے بلند ہونے والی سینتیس سیڑھیوں کے اوپر قلعہ جنگی کے چاندنی آلود کچے صحن میں جو جانور تھا شائد اس نے یہ فقرہ سنا اور اپنی موجودگی کی برقراری ثابت کرنے کے لیے ایک مرتبہ پھر ہنہنایا..

"وہ ابھی تک وہاں ہے.."

وہ اُٹھے...

کیسے اُٹھے.. یہ تو وہی جانتے تھے.. پیپ سے رِستے بدن کو مردہ کرتے زخموں.. ہڈیوں کی کرچیوں کی کٹھن برداشت کرتے.. بدن میں آرام کرتے ڈیزی کٹر کے لوہے.. بنکر بسٹر کے ٹکڑوں.. تین دن اور تین راتوں کی نڈھال بھوک اور پیاس کو سہارتے جانے کیسے اُٹھے.. مگر اُٹھے..

تیسری سیڑھی پر جو چاندنی جھجکتی ہوئی اُتری ہوئی تھی اُس کو نظر میں رکھتے ہوئے... روزِ حشر قبروں سے اٹھنے والوں کی مانند اپنی ہڈیاں سمیٹتے اٹھے..

"جانی..." عبدالوہاب نے اٹھتے ہوئے جان واکر کو ڈانٹ پلائی "تم اپنی کلاشنکوف کے بوجھ سے گرتے جا رہے ہو.. اسے کیوں ساتھ لا رہے ہو.. اوپر تو کوئی نہیں.. چاندنی کو شوٹ کرو گے؟"

"عبدالوہاب پچھلے ایک برس سے یہ متواتر میرے بدن سے جڑی ہوئی ہے۔ میری انگلیاں اس کے ٹرگر کے ساتھ پیدا ہوئی تھیں اور میری کمر کے اوپر جو حصہ ہے وہ اس کے بوجھ سے نیلا پڑ گیا ہے.. میں تو.. پچھلے ایک برس سے اس سے



الگ نہیں ہوا.. شِٹ بھی کرتا ہوں تو یہ میرے ساتھ ہوتی ہے.. ہم دونوں سیامی جڑواں بچے ہیں الگ الگ نہیں ہو سکتے.. اس کا پیوند میرے بدن میں جڑیں پکڑ چکا ہے.."

جانی ساتویں سیڑھی تک رینگتا گھسٹتا پہنچا اور جیسے اُس کی سکت خلاص ہو گئی اور وہ ڈھیر ہو گیا.. گیارہویں تک اللہ بخش گیا اور گر گیا.. عبدالوہاب انیسویں سیڑھی پر پہنچ کر ہمت ہار گیا لیکن چی چی بیسویں تک جا پہنچا..

کل سینتیس سیڑھیاں تھیں..

ہاشم اور گل شیر ولی بھی کہیں گرے ہوئے تھے.. مرتضٰی کا کچھ پتہ نہ تھا..

وہ اس قابل نہ تھے کہ حرکت کر سکیں اور سیڑھیوں پر چڑھنے کی کوشش میں وہ اپنی بچی کھچی توانائی گنوا بیٹھے تھے.. انہوں نے اپنے اپنے مقام سے حرکت کر کے غلطی کی تھی.. کچھ زخم کھل گئے تھے اور ٹوٹی ہوئی ہڈیاں ماس میں گہری ہو گئی تھیں... تین دن سے بھوکے اور پیاسے ماس میں میخوں کی مانند اُتر کر انہیں مصلوب کر رہی تھیں..

وہ اس مکمل مسمار شدہ حالت میں بہت دیر پڑے رہے..

تب تک جب تک چاندنی تیسری سیڑھی سے سمٹ کر پہلے سیڑھی تک واپس نہ چلی گئی..

جتنے وقفے میں چاندنی تیسری سیڑھی سے پہلی سیڑھی تک اٹھتی ہے اُتنے عرصے میں اُن کے نیم مردہ بدنوں نے تھوڑی سی توانائی جمع کر لی..

"چی چی..."

"ہاں اللہ بخش..."

"یار میرے حلق میں سُوکھا پھیل گیا ہے.. دراڑیں پڑ گئی ہیں.. مجھے پیاس مارتی ہے"

"تم اپنی نانی جان کے پاس نہیں گئے تھے.."

"بتایا تو ہے کہ وہ حربہ کام نہیں کرتا بھائی چی چی.. تمہارے چیچنیا میں بڑے ندی نالے اور نہریں ہوں گی پانی سے بھری ہوئی.. ہیں؟ ٹھنڈی ٹھار.. سینے میں ٹھنڈ ڈال دینے والی.. ہم ادھر سے فارغ ہو کر تمہارے مُلخ چلیں گے چی چی.."

"ہم ادھر سے کبھی فارغ نہیں ہوں گے اللہ بخش.."

"خیال ہی خیال میں.. نہیں"

"ہاں.."

"بھائی.. حسینؓ کی پیاس اس سے زیادہ تھی..؟"

"عقیدہ پیاس کو بڑھاتا ہے.. اُس کا تو مول پڑ گیا.. ہماری پیاس تو رائیگاں جائے گی.. اُٹھو.. ہمّت کرو.. گھوڑا چلا جائے گا"

اور جب وہ ہمت کر کے دوبارہ اُٹھے' اپنی نیم مردہ ہڈیوں کو گھسیٹتے سینتیسویں سیڑھی کے اوپر پہنچے تو واقعی گھوڑا جا چکا تھا..

لیکن انہوں نے پچھلے تین روز کے بعد پہلی بار اپنے سامنے قلعہ جنگی کے وسیع صحن کو دیکھا جس پر چاندنی کی بے مہر کرنیں اُترتی تھیں..

ایک سکوت تھا.. ہر شے پر.. اور ہر شے سے مراد ہر لاش تھی..

یقیناً آج جمعرات نہیں تھی ورنہ ہر لاش کے سرہانے دیئے جل رہے ہوتے.. صرف چاندنی جلتی تھی.. اور قلعہ جنگی کے کچے چوکور صحن کی وسعت کو بھرتی.. ہر لاش کو نمایاں کرتی.. ہر لاش کے برابر میں اُس کا سایہ ڈالتی چاندنی تھی.. اور بُو تھی.. جو ٹھہرتی نہ تھی.. ہوا کے دوش پر سوار آتی تھی اور اُن کے نتھنوں کو سکڑنے پر مجبور کرتی.. حلق سے اُبکائیاں اُبالتی تھی اور گزر جاتی تھی..

اُن میں کوئی بھی قابل شناخت نہ رہا تھا..

اُن میں سے بیشتر کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور وہ اوندھے



پڑے خاک چاٹتے تھے..

وہ چند ایک جن کے جبڑوں کے اندر سونے کا ایک آدھ دانت تھا اُن کے دہانے پھٹ چکے تھے..

کہیں کوئی ایک ٹانگ اُٹھی ہوئی لگتی تھی جیسے گھر واپسی کے لیے سفر کا آغاز کرنا چاہتی ہو اور کہیں ایک ہاتھ فضا میں بلند اکڑا ہوا.. جیسے اب بھی اپنا دفاع کرنا چاہتا ہو.. جن کے بُوٹ اور جاگر نئے اور کار آمد تھے اُن کے مردہ پاؤں اُنہیں کھو چکے تھے.. کسی بھی لاش کے گلے میں گرم مفلر نہیں تھا کیونکہ اسے آسانی سے اتارا جا سکتا ہے اور وہ ایک زندہ گلے کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے..

لاشوں کا ایک بے انت صحرا تھا.. جیسے ایک وسیع کھیت میں جگہ جگہ مینڈھیں اُبھری ہوئی ہوں.. اُن میں سے بیشتر اور وہ سینکڑوں کی تعداد میں تھیں.. ادھڑی ہوئی کٹی پھٹی حالت میں پڑی تھیں جیسے کسی بے رحم سرجن نے اُن کا پوسٹ مارٹم کر کے اُنہیں پھینک دیا ہو..

کچھ کی ٹانگیں اور کچھ کے کمر سے اوپر والے دھڑ مٹی میں دفن تھے.. جیسے وہ ریت میں کھیلتے بچے تھے.. چھپن چھپائی کھیلتے اپنی ٹانگیں چھپاتے تھے اپنے چہرے روپوش کرتے تھے..

انہیں انسانی ہاتھوں نے نہیں.. بی-باون طیاروں نے نیم دفن کیا تھا..

صحن میں جگہ جگہ گہرے گڑھے تھے جیسے وہاں مٹی کے آتش فشاں اُبل کر ٹھنڈے ہو گئے ہوں.. ایسے گڑھے تخلیق کرنا صرف ڈیزی کٹر ایسے منی ایٹم بم اور بنکر بسٹرز کے بس کی بات تھی..

ان بیوقوف لاشوں نے قندوز سے مزار شریف تک کا طویل صحرائی سفر صرف اس لیے کیا تھا کہ وہ اپنے ہتھیار رکھ کر قندھار کی جانب نکل جائیں.. اور جان سے نہ جائیں.. کہ یہی طے ہوا تھا..

ایک عجیب شہر خاموشاں اُن کے سامنے چاندنی میں آباد تھا..

وہ بھول گئے کہ تہہ خانے کی سینتیس سیڑھیاں طے کر کے وہ اوپر کیوں اور کس مقصد کے لیے آئے ہیں..

قلعہ جنگی کی کچی پستہ قد فصیلوں میں گھری چاندنی رات میں.. وہ بھول گئے کہ وہ اوپر.. یہاں.. جہاں شمال کی نشانچی اور گورے کمانڈو اُن کی تاک میں ہو سکتے تھے وہ کیوں آئے.. اس لیے کہ اُن کے سامنے عالم مثال کا ایک اوپن ایئر قبرستان تھا..

ہر لاش ایک قیاس میں تھی.. مٹی سے بھری.. شائد سر بریدہ مگر پھر بھی ایک کامل تصور میں تھی..

جہالت میں تھی اور پھر بھی ایک مثالی تصویر.. ایک ناقابل حصول نصب العین کی خواہش میں خاک ہوتی تھی.. ایک ایسے پختہ عقیدے میں گُم ہو دیتی تھی جو کہ خارجی عالم خیال کا عکس اور دھوکا تھا...

اور اس کا کوئی وجود نہ تھا..

یہ تصوریت تھی.. مثالیت تھی..

دنیا کو ایک مثالی شکل میں دیکھنے کی تمنا تھی جو قلعہ جنگی کے دھول بھرے صحن میں ہر لاش کے منہ کھلے چہرے پر چاندنی میں عیاں ہوتی تھی.. تمنا کا دوسرا قدم اُنہیں یہاں تک لے آیا تھا..

تمنا کا دوسرا قدم اُٹھانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی کہ یہ ہمیشہ فنا کی وادی میں لے جاتا ہے.. کسی نہ کسی قلعہ جنگی کے صحن میں آپ کو مردہ کر دیتا ہے..

اس تصور کامل کی تمنا کا کوئی جواز نہیں ہوتا.. کیونکہ عقل.. بالائے بام محو تماشہ رہنے کے لیے ہوتی ہے..

تو گویا آج جمعرات نہ تھی اور کسی کاسۂ سر کے سرہانے کوئی چراغ نہ جلتا



تھا.. صرف چاندنی تھی جو جلتی تھی اور تمنا کا دوسرا قدم اُٹھانے والوں کے مسخ شدہ چہروں کو عیاں کرتی تھی..

لاشوں کی رکاوٹ میں اٹکتی.. چاندنی کے سکوت پر سوار.. کہیں سے.. دور سے.. ایک ہلکی سی ہنہناہٹ کی آواز آئی..

وہ یکدم اُس تصور کامل کے سحر میں سے باہر آگئے.. چونک گئے.. اُن کے کان کھڑے ہو گئے.. وہ بھول گئے تھے لیکن اُنہیں یاد آگیا کہ وہ یہاں کیوں آئے تھے..

"گھوڑا ابھی تک یہاں ہے.." ہاشم میر نے سرگوشی کی..

"کہاں ہے؟"

"تم نے اُس کو نہیں سنا.."

"نہیں.. میں نے کچھ نہیں سنا.."

"وہ ہے.."

"کہاں؟"

وہ سب پہلی بار چاندنی میں سیدھے کھڑے ہوئے.. اس سے پیشتر وہ ڈرے ہوئے چوروں کی مانند کبڑے ہو کر اِدھر اُدھر گھومتے.. چوکنے ہو کر چلتے تھے..

"اُدھر دیکھو یارا.." گل شیر نے اتنی بلند آواز میں کہا کہ وہ سب کے سب دبک گئے کہ قلعہ جنگی کی لاشوں پر "اُدھر دیکھو یارا.. اُدھر دیکھو یارا" کی صدا گونجنے لگی.. لیکن اس صدا کو وہاں سننے والا کوئی نہ تھا..

"کدھر؟" جانی نے جھک کر سرگوشی کی..

"اُدھر.."

گھوڑا لنگڑا رہا تھا..

وہ پھر ہنہنایا.. اُس کی ہنہناہٹ میں زور نہ تھا..

شائد وہ بھی اُن کی مانند کئی روز سے بھوکا تھا.. فصیل کے قریب.. اُن سے بہت فاصلے پر.. وہ ہر لاش کے پاس رُکتا.. اُس کے چہرے کو چاٹتا.. اور جمے ہوئے سخت خون کو چاٹ کر اپنی پیاس بجھانا چاہتا.. اور پھر مایوسی سے ہنہنا کر ذرا آگے ہو جاتا..

قلعہ جنگی پر اُترتی چاند رات میں . . . جب کہ چند کلومیٹر پرے مزار شریف کے دھندلکے میں سے روشنیاں اُبھرتی اور ایک بستی میں زندگی کی نوید دیتی تھیں.. ایک لنگڑاتا ہوا گھوڑا اپنے حسینؓ کو تلاش کرتا تھا.. ہر لاش پر گردن جھکاتا تھا اُسے سونگھتا تھا لیکن اُسے شناخت نہیں کرپاتا تھا کیونکہ چہرے مسخ ہو چکے تھے، دھوپ اور موت نے اُن کی رنگت سیاہ کر دی تھی اگرچہ وہ سب کے سب سیاہ رنگت والے نہیں تھے.. سیاہ فام، گورے، بھورے اور زرد رنگتوں والے تھے لیکن موت کی سیاہی نے رنگ و نسل کو مٹا کر اُن میں دھول بھر دی تھی.. امتیاز مٹا دیا تھا اور وہ پہچان کے جہان سے دُور جا چکے تھے..

گھوڑا اُن میں سے اپنے سوار کو کیسے پہچان سکتا تھا..

سوار اگر یکجا ہو.. مجتمع ہو تبھی اُس کی پہچان ہو سکتی ہے لیکن اُن میں سے بیشتر تو بکھرے پڑے تھے.. اُن کے اعضاء ایک دوسرے سے روٹھے ہوئے دور دور پڑے تھے.. بازو کہیں ہتھیلیاں پھیلائے پڑے ہیں اور دھڑ کا ایک حصہ کہیں اور گل سڑ رہا ہے.. اور جو سر.. سر بلند نہیں ہو سکتا وہ کسی کچی دیوار سے ٹیک لگائے لڑھکنے سے بچتا ہے.. بی-باون طیاروں نے کیا خوب اُن کی تقسیم کی تھی..

تو پھر ایک ناتواں بھوکا پیاسا اور لنگڑا گھوڑا اُن بکھرے ہوئے اعضاء کو کیسے جمع کر کے پھر جوڑ کر اُن میں سے اپنے سوار کو کیسے پہچان سکتا تھا..

گھوڑا اُن کے زیر زمین ٹھکانے میں سے اُٹھتی اور قلعہ جنگی کے صحن



میں اختتام کو پہنچتی سینتیس سیڑھیوں سے بہت پرے.. قلعے کی کچی فصیل کے سائے میں ایک لاش کو بہت دیر سے سونگھ رہا تھا..

"چلو.."

"نہیں عبدالوہاب.. ہم ابھی تک ایک کوٹھڑی کے سائے میں پوشیدہ ہیں.. چاندنی میں نہیں گئے.. یہاں سے وہاں تک.. کچی فصیل تک پہنچنے کے لیے ہمیں اس سائے میں سے نکل کر کھلی چاندنی میں اپنے آپ کو ظاہر کر دینا ہو گا اور وہ.. ہمیں دیکھ لیں گے.."

"وہ.. یہاں نہیں ہیں ہاشم.. لاشوں کا کوئی چوکیدار نہیں ہوتا کیونکہ وہ فرار نہیں ہو سکتیں.. اُن کے لیے ہم کب کے لاشیں ہو چکے ہیں اس لیے وہ صحن کے آس پاس کہیں نہیں ہو سکتے.. ہاں فصیل کے نشیب میں شائد وہ ہوں.. ویسے کیا فرق پڑتا ہے اگر وہ ہیں یا نہیں.. ہم نے بہر حال ان لاشوں میں شامل ہونا ہے.. چلو.. گھوڑے کو قابو کرو.."

وہ سائے میں سے برآمد ہو کر چاندنی میں برہنہ ہو گئے.. یہ سچی اور کھری چاندنی نہ تھی اس کی خصلت میں مکر تھا.. اس کی کرنوں میں فریب تھا.. روشنی میں مکاری تھی.. وہ جان بوجھ کر اُنہیں ضرورت سے زیادہ عیاں کرتی تھی اتنا عیاں کرتی تھی کہ بلخ کے کھنڈروں میں براجمان بوڑھا آتش پرست اُن کے سائے اپنے سامنے جلتی آگ میں لرزاں دیکھ سکتا تھا..

اس عیار اور دھوکے باز چاندنی میں وہ جھکے ہوئے.. کبڑے ہو کر کارٹون کرداروں کی مانند مزاحیہ انداز میں اپنے آپ کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش میں جھکے جھکے گھوڑے کی جانب چلنے لگے.. تازہ.. کھلی اور بے دریغ ہوا ایک مدّت کے بعد اُن کے بدنوں کو چھوتی ہوئی نکلی تو اُس کی تازگی نے ہڈیوں کی کرچیوں کو تیکھا اور اذیت ناک کر دیا.. اور اُن کی چبھن نے ٹیسوں کو آسمان تک پہنچایا اور برداشت

سے باہر بھوک کا لاغرپن اُن کے خشک ہوتے دماغوں میں لڑھکنے لگا..

وہ جب بھی گرتے.. کسی لاش پر گرتے..

راستے میں رکاوٹیں بہت تھیں..

قلعہ جنگی کے کھیت میں مینڈھیں ہر جگہ تھیں..

جب بھی ٹھوکر کھاتے وہ کسی لاش سے ٹھوکر کھاتے.. وہ دیکھ کر نہیں چلتے تھے.. نہ ہی دیکھا جا سکتا تھا.. اگر دیکھ سکتے تو بھی راستے میں پڑتی اکڑتی لاشوں کے درمیان پاؤں دھرنے کی جگہ کم تھی.. اس لیے وہ چلتے تھے تو لاشوں پر قدم رکھتے چلتے تھے..

"میرا خیال ہے وہ شیر محمد تھا..." اللہ بخش نے جھکے جھکے چلتے مرتضیٰ کے قریب ہو کر سرگوشی کی.. اور وہ چاندنی شائد اپنے اندر ہائی فائی سپیکر رکھتی تھی جس نے اُس کی سرگوشی کو بلند کر کے پورے قلعہ جنگی پر پھیلا دیا اور... میرا خیال ہے وہ شیر محمد تھا.. شیر محمد تھا.. ہر سو گونجنے لگا..

"کون شیر محمد تھا؟"

"جس پر میں ابھی ابھی گرا تھا.. منہ بھار گرا ہوں تو اُس کے چہرے پر جا لگا ہوں.. اکڑا ہوا ٹھنڈا برف تھا یہاں تک کہ اُس کی نروئی پہلی داڑھی کے نرم بال بھی کانٹے ہو رہے تھے... سردی سے جم گئے تھے.. مجھے شک پڑا کہ وہ شیر محمد ہے.."

"ہو گا..."

"میرا خیال ہے کہ وہی تھا.. اگر وہی تھا تو مجھے تھوڑی دیر اُس کے پاس بیٹھنا چاہیے تھا اُس سے افسوس کرنا چاہیے تھا.."

"مرے ہوئے بندے سے تم نے افسوس کرنا تھا.."

"آہو بھائی مرتضیٰ.. اب اُس کے مرنے کا افسوس کس سے کریں.. اُس



سے کر لیتے.."

"اللہ بخش خاموش رہو.. چپکے سے چلتے رہو.."

"اُس کا ایک بھائی کشمیر میں شہید ہو گیا تھا.. اُس کی لاش گاؤں پہنچی تو اُس کے باپ نے برادری کو رونے سے منع کر دیا اور کہا یہ بیٹا تو کیا میں اپنے چھوٹے بیٹے کو بھی جہاد پر روانہ کروں گا اور اُس کی شہادت کی دعا کروں گا.. لگتا ہے اُس کے باپ کی دعا قبول ہو گئی.."

"لیکن وہ یہاں آنا نہیں چاہتا تھا.. باپ کی خوشی کے لیے آ گیا تھا.. ہنس مکھ تھا سیاہ پگڑی کے نیچے بھی اُس کی آنکھیں مسکراتی رہتی تھیں.. کیا واقعی وہ شیر محمد تھا؟"

"اُس کی ناک سیدھی اور تیز تھی.. گجرات کے لوگوں کی ناکیں اونچی اور تیکھی ہوتی ہیں.. مجھے لگا کہ اُس کی ناک تھی.."

"تم نے صرف ناک سے اندازہ لگا لیا کہ وہ شیر محمد تھا؟.. سردی اور موت میں تین دِن پرانی سب لاشوں کی ناکیں سیدھی اور تیکھی ہو جاتی ہیں.."

کبڑے ہو کر چلتے.. ٹھوکروں سے بچتے.. کچی فصیل کو نظر میں رکھتے چلتے اُنہیں بہت دیر ہو گئی تھی..

وہاں واقعی کوئی ذی روح نہ تھا..

اگر کوئی ایک بھی ہوتا تو قلعہ جنگی کے کچے صحن پر پھیلی مکر چاندنی کو فریب دینے کی کوشش میں مبتلا اُن جھکے جھکے.. کارٹون کرداروں کی مانند جھکے جھکے اجسام کو واضح طور پر دیکھ لیتا..

گھوڑے کے نتھنوں نے اُن کی قربت سے بہت پہلے اُن کی موجودگی محسوس کر لی اور اُس کے کان چوکنے ہو گئے.. وہ کھلی چاندنی میں نہ تھا فصیل کے سائے میں کھڑا تھا..

وہ قریب ہوئے تو گھوڑے نے سر اُٹھایا.. اُس کی تھوتھنی پر جمے ہوئے خون کی پپڑیاں چمٹی ہوئی تھیں اور اُس کی آنکھیں مردہ تھیں.. مردوں کو دیکھ دیکھ کر اُس کی آنکھیں مردہ ہو چکی تھیں..

اُس کی باگیں گردن سے لٹکتی مٹی کو چھو رہی تھیں..

وہ رک گئے..

گھوڑا سر اُٹھائے اُنہیں بغیر کسی رد عمل کے مردہ آنکھوں سے تکتا رہا..

"ٹھہرو.." جانی پیچھے رہ گیا تھا.. وہ لنگڑاتا ہوا اُن کے پاس پہنچا.. اور رُک گیا.. وہ سب دیکھ نہیں سکتے تھے لیکن جانی کی آنکھوں میں ایک عجیب سی اُلفت اور آسودگی آئی جب اُس نے گھوڑے پر نظر ڈالی.. اُس کے چہرے سے بھوک کی نقاہت زائل ہو گئی اور وہ تر و تازہ دکھائی دینے لگا.. وہ لنگڑاتا ہوا آگے ہوا.. اور گھوڑے کی پشت پر ایک ہلکی سی تھپکی دی".. ہو ہو.." اُس نے زیر لب کہا.. پشت کے ماس میں اس لمس سے ایک تھرتھراہٹ تیری اور وہ تھوتھنی اُٹھا کر ہنہنایا... ای ہی ہی..

دم بخود چاندنی نے اُس کی ہنہناہٹ کو بھی دوچند کر کے قلعہ جنگی کے پورے صحن پر نشر کر دیا..

"جانی.. گھوڑے کو مت تھپکو.."

"مجھے گھوڑوں کے بارے میں مت بتاؤ.." جانی نے گھوڑے کی پشت پر سے ہتھیلی اُٹھائے بغیر غصے سے کہا "میں بچپن سے گھوڑوں کے ساتھ کھیلتا آیا ہوں.. امریکہ میں میرا اپنا.. ایک ذاتی پونی تھا.. براؤنی.. میں گھوڑوں کو جانتا ہوں.."

"تم رائڈنگ آؤٹ فٹ میں ملبوس امریکہ کے سبزہ زاروں میں دُلکی چلتے گھریلو قسم کے گھوڑوں کو جانتے ہو جانی.."



"گھوڑے ہر جگہ گھوڑے ہوتے ہیں.."

"نہیں.. قلعہ جنگی کے اوپن ایئر قبرستان میں لاشوں کو چاٹتے گھوڑے کچھ اور ہوتے ہیں.."

"شٹ اپ ہاشم میر.. اور مجھے پلیز ڈسٹرب نہ کرو میں اس جانور کو جاننا چاہتا ہوں.. یہ میرے براؤنی سے مختلف نہیں ہو سکتا.."

جب کہ جانی.. جان واکر عبدالحمید سلمان الفارسی.. گھوڑے کی پشت کو آہستہ آہستہ پیار سے سہلاتا تھا وہ رینگتے ہوئے ایک تجسّس میں مبتلا کچی فصیل میں ہتھیار جمانے کے لیے جو رخنے اور محرابیں تھیں اُن تک چلے گئے..

گھوڑا جانی کی سپرداری میں تھا اور وہ متجسّس تھے کہ فصیل کے پار اس سے کیا دکھائی دے رہا ہے..

جہاں وہ تھے قلعہ جنگی میں.. یہ حصار مزار شریف کے شہر سے کچھ فاصلے پر ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان ایک بلند سطح پر پھیلا ہوا تھا..

اُنہوں نے قریب ہو کر رخنوں اور محرابوں سے اپنی آنکھیں لگائیں تو مزار شریف کی روشنیاں صحرا کے سراب.. جھلملاتی.. مگر چاندنی میں سرائت کرتیں اُن تک آئیں.. اور اِن میں روشنی کا جو سب سے بڑا جمگھٹا تھا وہ اُس شاندار نیلی اینٹوں والی گنبدوں میں اُبھری ہوئی عمارت میں سے جنم لیتا تھا جس کے بارے میں روائت تھی کہ وہ حضرت علیؓ کا مرقد ہے.. اور اِس روائت نے ایک خواب سے جنم لیا.. کہا جاتا تھا کہ بلخ شہر جو مولانا رُوم کی جنم بھومی تھا وہاں کے ایک پارسا کو کئی راتوں تک مسلسل ایک خواب میں حضرت علیؓ بلخ سے کچھ فاصلے پر اپنی آخری آرام گاہ کی نشاندہی کرتے رہے.. اور جب اُس مقام پر کھدائی کی گئی تو وہاں سے حضرت علیؓ کے ہاتھوں کا لکھا ہوا ایک قرآن پاک اور چند ہڈیاں برآمد ہوئیں اور پھر اُسی مقام پر اُن کا مزار تعمیر کیا گیا.. یہ مزار شریف خلق خدا کی توجہ

اور عقیدے کا محور رہا اور یہاں اس بستی کا ظہور ہوا اور بلخ کا قدیم شہر لاوارث ہو کر اُجڑ گیا..

رخنوں‘ محرابوں اور کچے قلعے کی برجیوں میں سے وہ اُس مزار کی عمارت سے اُٹھنے والی روشنیوں کو تکتے تھے.. یہ روشنیاں طالبان نے گل کر دی تھیں کیونکہ وہ انہیں بدعت سمجھتے تھے..

جانی بدستور گھوڑے کی پیٹھ تھپکتا اُسے دلاسے دیتا تھا..

اور اس مزار شریف سے پرے جہاں کبھی ہزاروں آتش کدے روشن ہوا کرتے تھے وہاں بلخ کے کھنڈر تاریکی کی اتھاہ گہرائیوں میں گم تھے..

شائد یہ اُن کا واہمہ تھا.. اُن کا جو محرابوں اور رخنوں میں سے جھانکتے تھے کہ جدھر.. جس گنگ اور نابینا سیاہی کا کھنڈر راج تھا وہاں اُدھر.. اُنہیں ایک شعلہ دکھائی دیتا تھا.. اُن سب کی آنکھوں میں وہ ایک واہمہ.. ایک شعلہ جو بلخ کے کھنڈروں میں روشن تھا‘ بھڑکتا تھا.. اگرچہ یہ ممکنات میں بھی ممکن نہ تھا کہ وہاں ابھی تک زرتشت کی آگ جل رہی ہو..

اُس کا عقیدہ کچھ بھی ہو یا بے شک لامذہب ہو.. ہر نفس کسی نہ کسی آگ کا پجاری ہوتا ہے.. اور اُس آگ میں جل مرنا چاہتا ہے.. اُس میں بھسم ہو کر رفعتوں تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے.. تصور کامل تک!

آتش کدۂ بلخ پر بے شک تاریکی حکمران تھی.. اتنی سیاہ کہ اُس پر چاندنی بھی اثر نہ کرتی تھی لیکن قلعہ جنگی کے رخنوں اور محرابوں میں آنکھیں رکھنے والوں کو شائبہ ہوتا تھا کہ وہاں آگ ہے!

”یارا عبدالوہاب.. اُدھر جو اتنا روشنی کا چکا چوند ہے مزار شریف میں تو یارا اس وقت اُدھر لوگ مزا کرتا ہے.. ٹیلی ویژن دیکھتا ہے اور ریڈیو سنتا ہے اور ناچتا گاتا ہم پر فتح کا جشن مناتا ہے.. ہم اگر یہاں سے نکل کر نیچے چلا جائے.. اپنی سیاہ



پگڑی اُتار کر.. تم ہم بھی مزا کر سکتا ہے.. زندہ سلامت رہ سکتا ہے.. کہ نہیں؟“

”نہیں گل شیر ولی.. ہم زندہ نہیں.. مر چکے ہیں.. دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتے.. ہم اُن کے ہم وطن نہیں‘ غیر ہیں.. اُنہوں نے.. ہمارے طالبان اور شمال والوں نے پھر سے گھل مل جانا ہے.. لیکن نیچے جو مزار شریف کے شمالی ہیں وہ ہمیں معاف نہیں کر سکتے.. طالبان کو معاف کر دیں گے.. وہ ہمیں زیادہ ذمہ دار سمجھتے ہیں.. اُنہوں نے ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ کر سر میں گولی مار کر غلاظت کے ڈھیروں پر پھینک دینا ہے کہ ہم وہ غیر لوگ تھے جو اپنے ملک چھوڑ کر اُن کے ملک میں اپنے خواب پورے کرنے آئے تھے..“

”اُنہوں نے ہمارے ساتھ مشاورت بھی نہیں کی.. ہمارے طالبان بھائیوں نے اور اپنے شمالیوں کے ساتھ قندوز کے بعد ہتھیار ڈال دینے کا معاہدہ کر لیا..“ چی چی بولا اور اُس کے لہجے میں کڑواہٹ تھی..

”چی چی“ مرتضٰی بیگ نے محراب سے آنکھیں ہٹا کر اُس کی جانب دیکھا لیکن وہ فصیل کے سائے میں تھا.. وہ نظر نہیں آ رہا تھا ”چی چی ہم اُن کے لیے تو نہیں‘ اپنے لیے یہاں آئے تھے.. وہ ہم سے کیوں پوچھتے..“

”بھائی مرتضٰی.. مجھے گھر یاد آتا ہے.. ماں یاد آتی ہے“

”آخری وقت میں یہ سب کچھ یاد آیا کرتا ہے اللہ بخش“

”ہم جنت میں جائیں گے ناں.. ہمیں مرنے کے بعد بھی رزق ملے گا ناں؟“

”ہم جائیں گے تو شمال والے بھی ہمارے پیچھے پیچھے چلے آئیں گے.. وہ بھی تو ہماری طرح شریعت کے پابند ہیں‘ مسلمان ہیں.. ہاشم میر نے ایک شمالی پر فائر کیا اور پھر اُس کے نزدیک ہوا یہ جاننے کے لیے کہ وہ مر چکا ہے یا نہیں تو اُس کی سفید داڑھی جو اُبلتے خون سے سرخ ہو رہی تھی اُس کے لبوں کے ساتھ ہل رہی

تھی اور وہ کلمہ پڑھ رہا تھا..''

''مجھے ڈر آ رہا ہے آئندہ سے.. میں گھر جانا چاہتا ہوں''

''ہمارا وہی گھر ہے.. وہ تہہ خانہ جس میں ہم اپنے آپ کو چھپائے ہوئے ہیں.. اور اگر ہم اُس گھوڑے کو جس کے ساتھ جانی لاڈ پیار کر رہا ہے تہہ خانے میں نہیں لے جاتے تو کل تک زمین کے رزق سے بے نیاز ہو جائیں گے اور آسمانوں کے رزق کا کیا پتہ ملتا ہے یا نہیں ملتا.. اس لیے دو چار دن کی زندگی کے لیے.. گھوڑے کو لے چلو.. آؤ!''

گھوڑا سدھایا جا چکا تھا.. جانی اُس کی پشت پر تھپکی دیتا تھا تو وہ جواب میں تھوتھنی اُٹھا کر اپنی مسرت کا اظہار کرتا تھا..

''اب بے شک اس کی باگیں تھام لو.. یہ تمہارے پیچھے پیچھے چلا آئے گا..'' جانی نے ایک آخری تھپکی دی تو گھوڑا ایک بار پھر ہنہنایا.. چاندنی کے سفید رتھ پر سوار اُس کی ہنہناہٹ شائد بلخ کے آخری آتش پرست کے سامنے جلتی آگ تک گئی اور اُس کے شعلے میں ایک نامعلوم سی لرزش نے جنم لیا..

ہاشم نے آگے بڑھ کر اُس کی باگیں اُٹھائیں اور اس سے پیشتر کہ وہ اُس کے نتھنوں کو اذیت دیتیں وہ سر جھکا کر اُس کے پیچھے چلنے لگا.. لنگڑاتا ہوا چلنے لگا..

وہ زخمی تھا.. اگر وہ صحت مند بھی ہوتا تو لاشوں کو ٹاپتا انہیں ہر قدم پر اپنے سموں کے آگے پا کر جھجکتا.. لنگڑا ہی معلوم پڑتا..

''وہ شیر محمد ہی تھا'' اُن کے عقب میں سے اللہ بخش کی آواز اُن تک آئی اور اُنہیں پہلی بار احساس ہوا کہ وہ اُن سے بہت پیچھے رہ گیا تھا..

گھوڑے کی باگ ہاشم کی زخمی اُنگلیوں کو اذیت دے رہی تھی۔ شیر محمد کی آواز سن کر اس نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی۔ وہ ایک ماہر ایتھلیٹ کی مانند لاشوں پر سے کودتا.. اپنی نقاہت اور پیپ بھرے زخم فراموش کرتا بھاگتا ٹاپتا چلا آ رہا تھا..



''وہ شیر محمد ہی تھا.. آہو'' وہ اپنے ہیجان میں اور پھولے ہوئے سانس میں بے ربط ہو رہا تھا'' مجھے.. مجھے یاد تھا کہ فصیل کی جانب جاتے ہوئے میں کہاں اور کس پر گرا تھا.. واپسی پر میں نے اُس کے پاس بیٹھ کر اُسے غور سے دیکھا ہے۔ وہ دانت نکوسے ہونٹ سکیڑے مرا پڑا تھا.. شکر ہے اُس کا کوئی دانت سونے کا نہ تھا.. اور میں نے اُسے پہچان لیا..''

''شٹ اپ اللہ بخش.. کیپ کوائٹ.. تم گھوڑے کو نروس کر دو گے..''

''پتہ ہے جانی کیسے پہچان لیا.. اُس کے ہونٹ اُسی مسکراہٹ میں سکڑے ہوئے تھے جو ماہیا گاتے ہوئے اُس کے چہرے پر پھیلتی تھی.. میں نے اُسے ہلا جلا کر دیکھا ہے.. اُس کے ہاتھ بھی پشت پر بندھے ہوئے تھے اور میں نے کھول دیئے.. اپنے ایک بیلی کے لیے اتنا تو کرنا چاہیے.. ویسے اُسے مرتے ہوئے زیادہ تکلیف نہیں ہوئی ہو گی.. اُس کا جثہ بہت بھاری ہو رہا تھا' مردہ ہونے سے بھی اور مشین گن کی درجنوں گولیوں کے بھار سے بھی تو وہ دوسروں کی طرح سسک سسک کر نہیں مرا یکدم مر گیا ہو گا.. اُسے تکلیف نہیں ہو گی.. میرا جی چاہتا تھا کہ اُسے گھسیٹ کر اپنے ساتھ تہہ خانے میں لے چلوں.. پر سکت نہیں تھی' وہ بہت بھاری ہے.. میں بہت خوش ہوں کہ میں نے اُسے پہچان لیا ہے..''

وہ صحن کے عین درمیان میں بھوتوں کی طرح چاندنی میں کھڑے تھے..

گھوڑے نے بھی اپنے کان ہلائے تھے جیسے اللہ بخش کی یاوہ گوئی میں دلچسپی لے رہا ہو..

یہ ستانے کا ایک بہانہ بھی تھا..

اُن سب کی مکمل چپ سے اللہ بخش کا شیر محمد کو پہچان جانے کا جوش یکدم ٹھنڈا پڑ گیا اور کچھ دیر کھانسنے کے بعد وہ بھی چپ ہو گیا..

ڈھول پٹے بیکار ہو چکے کیڑوں کی خوراک سینکڑوں سرد اجسام کے

درمیان.. مگر چاندنی میں نہائے ہوئے وہ سب اور گھوڑا مکمل چپ میں حنوط کھڑے تھے جیسے سنگی مجسمے ہوں.. موت کی آرٹ گیلری میں نمائش پر ہوں۔ اُن پر جو لمحہ وارد ہوا تھا اُس میں وہ فراموش کر چکے تھے کہ وہ کہاں ہیں اور کیوں ہیں.. اُس لمحے وہ مٹی میں اٹی ہوئی بے انت لاشوں جتنے ہی بے جان اور مردہ تھے.. سانس بھی نہ لیتے تھے.. کسی طلسم کے سائے میں تھے.. بُت ہو چکے چُپ کے سکوت میں بے جان بے حس تھے..

اُنہیں کسی مجسمہ ساز نے اسی حالت میں تراش دیا تھا.. ایک گھوڑا اور اُس کے آس پاس چیتھڑوں میں ڈھکے ان ڈھکے دریدہ بدن قبل از تاریخ کے چند انسان.. جو ابھی تو اتنے لاغر تھے کہ قدم قدم پہ ڈھے جاتے تھے اور اب ایک مدت سے یوں کھڑے تھے جیسے اُن کی تصویر بن گئی ہو اور وہ جس حالت میں تھے اُس میں تھم گئے ہوں..

دُھول بیٹھ چکی تھی..

وہ مر چکے لوگوں کے نتھنوں اور آنکھوں میں بھر چکی تھی..

لاشوں کے اوپر جو فضا تھی وہ صاف شفاف اور سرد تھی..

اس میں اگر کوئی سانس لینے والا ہوتا تو ایک نتھرا ہوا سانس لے سکتا تھا..

چاندنی کے بے حساب مکر میں وہ سب اور گھوڑا شائد کئی صدیوں تک سکوت میں رہے اور پھر وہ یکدم وارد ہونے والا لمحہ یکدم دفن ہوا اور اُس کی قبر میں سے موسیقی اور والہانہ گیتوں کی آواز باہر آئی اور اُن سب کے گرد پھیلنے لگی..

گھوڑا سب سے پہلے اس سکوت میں سے باہر آیا اور گردن اُٹھا کر آہستگی سے ہنہنایا..

اُس کے ہنہنانے سے یہ طلسم ٹوٹا اور وہ سب بھی زندہ ہو گئے..

کچے روزنوں اور محرابوں میں سے موسیقی کی مدھم دُھنیں گزرتی تھیں اور



قلعہ جنگی کے صحن میں پھیلی مکر چاندنی کے سہارے اُن تک پہنچتی تھیں..

وہ پھر سے زندہ ہوئے.. مجسمے کے روپ بہروپ سے باہر سکوت ترک کر کے آئے تو پھر سے چلنے لگے..

گھوڑے کے پیچھے پیچھے چلنے والوں کو آسانی یہ تھی کہ وہ اب لاشوں پر چلتے ٹھوکر نہیں کھاتے تھے جہاں گھوڑا جھجک کر پاؤں اٹھاتا وہ بھی احتیاط کرتے تھے۔ لیکن ایک کائناتی خاموشی کے بعد اُن کے کانوں میں جو موسیقی لہریں لیتی در آئی تھی اُس نے اُنہیں زندگی کے قریب کر دیا..

جانی اُس کی نامانوس دُھن پر سر ہلاتا جا رہا تھا.. ایک عرصے کے بعد اُس نے موسیقی کو اپنے اندر اُترنے دیا تھا.. اگرچہ اُسے پشیمان ہونا چاہیے تھا کہ ایک حرام شے اُس کے اندر اُتر رہی ہے لیکن وہ سر ہلاتا چلا جا رہا تھا کہ اُس کا.. حالت کفر میں مبتلا بدنی نظام اُسے بے اختیار کرتا تھا.. اُس نے رُکے بغیر مرتضٰی کو مخاطب کیا "موسیقی کے ساتھ جو گیت سنائی دے رہے ہیں کیا تم ان کو سمجھ سکتے ہو؟.. یہ ہم سے کیا کہتے ہیں؟"

"یہ ہم سے کچھ نہیں کہتے امریکی.." مرتضٰی نے اپنی داڑھی میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کہا.. بالوں میں کسی زخم کی کھرچن سخت ہو رہی تھی...

"یہ گیت بھی نہیں جانتے کہ ہم یہاں ابھی تک زندہ ہیں.. یہ صرف دو زبانوں میں ہو سکتے ہیں.. پشتو میں یا پھر فارسی میں.."

"تو پھر یہ فارسی میں ہوں گے.. شمال والے گا بجا رہے ہیں.. اگر یہ پشتو میں ہوتے تو اُس کے چند لفظ میں بھی سمجھ لیتا ہوں.. تمہارے ہاں فارسی کو ایک کلاسیکی زبان کی حیثیت سے تو پڑھا جاتا ہے میں یہ بھی جانتا ہوں.."

"ویسے میں نے بھی فارسی تو تھوڑی بہت پڑھی تھی سکول میں" مرتضٰی کے لہجے میں ایک سکول کے بچّے ایسی معصوم خوشی جھلکتی تھی "بس اتنا یاد رہ گیا

ہے کہ است.. کا مطلب.. ہے.. اور بود کے معنی... تھا.. اور مجھے جو کچھ ہلکا ہلکا سنائی دے رہا ہے تو اس میں کہیں "است" یا "بود" سنائی نہیں دے رہا.." مرتضٰی یکدم خاموش ہو گیا.. دیر بعد بولا تو ایک موت کے منتظر مریض کے لہجے میں بولا "جانی... ہم سب "است" اور "بُود" سے ماورا ہو چکے ہیں"

وہ اپنے گھر کے قریب پہنچ گئے..

اُنہیں قلق ہوا کہ وہ اپنے گھر کے قریب پہنچ گئے ہیں..

اس گھر میں اُترنے کے بعد.. سینتیس سیڑھیاں اُترنے کے بعد یہ امکان کم تھا کہ اُنہوں نے کبھی کھلی فضا میں پھر باہر آنا تھا.. بے شک قلعہ جنگی کی کھلی فضا میں مردوں کے تعفن سے اُٹھنے والی ناقابل برداشت بدبُو راج کرتی تھی.. پھر بھی اُنہیں قلق ہوا... جیسے دنیا چاہے کتنی ہی اذیت ناک کیوں نہ ہو اُسے چھوڑ کر خود قبر میں اُترنے کو جی نہیں چاہتا.. اُن کی جو قبر تھی اُس میں اُترنے کے لیے سینتیس سیڑھیوں کی سہولت تھی..

اگر تو صرف خود سے اُس قبر میں اُترنا ہوتا تو کچھ آسان ہوتا مگر اپنے ساتھ ایک گھوڑے کو بھی اُتارنا.. ایک ایسا مسئلہ تھا جس کا حل فقہ کی کسی کتاب میں نہیں ملتا تھا.. اُنہوں نے اپنے گھر میں اُترنے سے پیشتر ایک آخری نگاہ قلعہ جنگی کے صحن پر ڈالی.. وہ اب مٹی بھری سر بریدہ مسخ شدہ اس صحن میں بکھری لاتعداد لاشوں سے متاثر نہ ہوتے تھے جن پر اولین کیڑوں مکوڑوں کی آمدورفت شروع ہو چکی تھی کہ وہ اب اُس لینڈ سکیپ کا ایک حصہ بن چکی تھیں.. اُن کے بغیر شائد وہ اسے پہچان بھی نہ سکتے.. جیسے "لاسٹ سپر" کی تصویر کو حضرت عیسیٰؑ اور اُن کے حواریوں کے بغیر نہیں پہچانا جا سکتا.. مزار شریف کی بستی سے اُبھر کر اس بلند میدان میں اُترنے والی موسیقی اور اُس میں غل مچاتی آوازوں کو اُنہوں نے آخری بار سنا.. اور پھر گھوڑے کی پشت پر ہتھیلیاں جما کر اُسے سیڑھیوں سے اُتارنے کے



لیے دھکیلنے لگے.. مجبور کرنے لگے..

گھوڑوں کو عام طور پر سیڑھیوں سے اُترنے کی تربیت نہیں دی جاتی... اس لیے وہ بُری طرح جھجکتے ہیں.. ہنہناتے ہیں اور مدافعت کرتے ہیں.. پچھلی ٹانگوں پر پیچھے ہوتے جاتے ہیں۔ یہی کچھ اس گھوڑے نے بھی حتی المقدور کیا.. اپنی اگلی ٹانگوں میں زور بھر کر پیچھے ہو جانے کی سعی کی.. انکاری ہو گیا.. لیکن اُس کی پشت اور پسلیوں پر جمے ہاتھ بہت تھے اگرچہ اُن کی گرفت میں نقاہت تھی پھر بھی بہت تھے.. اور اگر اُن میں نقاہت تھی تو گھوڑے کا بدن بھی تو لاغر اور کمزور ہو چکا تھا.. وہ اُن ہاتھوں کا کہنا مان گیا اور اپنی ٹانگوں میں سے سکت خارج کر دی اور دھکیلا جانے لگا..

اٹکتا.. ٹھوکریں کھاتا.. اگرچہ ہر سیڑھی پر جھجکتا خوف کھاتا.. اُترنے لگا.. اُس کی لشکیلی پشت پر ابھی تو مگر چاندنی کا غبار ٹھہرا ہوا تھا اور ابھی وہ ایک اندھیری گپھا کی تاریکی میں جانے لگا..

پہلے تو ہر لاش دکھائی دیتی تھی مگر اب نیچے تہہ خانے میں کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا.. بے شک وہاں صحن میں لاشیں تھیں لیکن اُنہیں بھی دیکھنا اچھا لگتا تھا کہ آنکھیں دیکھنے کے لیے ہوتی ہیں..

ہاشم نے ابھی تک اُس کی باگ ڈھیلی چھوڑ رکھی تھی لیکن اب وہ اُسے تناؤ میں لا کر کھینچتا جاتا تھا اور گھوڑا اُترتا جاتا تھا..

سب نے اپنی اپنی ہتھیلیاں ہٹالی تھیں اور وہ بھی اٹکتے ٹھوکریں کھاتے نیچے آرہے تھے.. چاندنی کا غبار ابھی تک اُن کی آنکھوں میں ٹھہرا ہوا تھا اور وہ کچھ بھی دیکھ نہ سکتے تھے..

سب نیچے اُتر آئے تھے لیکن گل شیر ولی ابھی تک پہلی سیڑھی پر کھڑا چاندنی میں تھا.. "اوئے خاناں.. " اللہ بخش پکار اُٹھا "اوئے خانہ خراب اوپر کیا

کر رہے ہو.. نیچے آجاؤ.. مرنا ہے؟"

"ہاں یارا.. مرنا ہے" اُس کی ہنسی میں ایک فاترالعقل ہیجان تھا "یارا اوپر یا نیچے مرنا ہے تو بندہ اس کافر چاندنی میں مرے.. ہم تھوڑا مزہ کرتا ہے۔ نظارہ کرتا ہے یارا.. دِیر میں بھی ایسا چاندنی ہوا کرتا تھا.."

"خاں صاحب رومینٹک ہوگئے ہیں ہاشم میر.. اس کو نیچے لے آؤ" مرتضٰی کے لہجے میں تشویش تھی "نہیں آتا تو زبردستی لے آؤ.. اتنا اونچا بول رہا ہے کہ مزار شریف تک اس کی آواز پہنچ رہی ہو گی.."

"زبردستی کرنے سے گھوڑا تو نیچے چلا گیا تھا مرتضٰی بھائی.. گل شیر ولی نہیں آئے گا. تھوڑا صبر کرو خود آجائے گا.. ادھر اکیلا تو جہاد نہیں کرے گا.. پر یارا اس نظارہ کو چھوڑ کر نیچے آنے کا کافر دل نہیں مانتا.."

"نیچے آجاؤ گل شیر.." مرتضٰی نے دھمکی دی "اگر قلعہ جنگی کے صحن میں چلتے پھرتے ہمیں کسی شمالی نے نہیں دیکھا تو تم چاہتے ہو کہ اب کوئی دیکھ لے.. نیچے آجاؤ ورنہ میں خود آتا ہوں.."

"میں تو آجاؤں گا... لیکن ہمارا گورا بھائی جانی کیسے آئے گا جو ابھی تک اُدھر لاشوں میں گھومتا ہے.. جُھک جُھک کر اُن کے مردہ چہروں میں جانے کیا دیکھتا ہے.."

اُنہیں پہلی بار احساس ہوا کہ جانی بھی اُن میں نہیں ہے..

تاریکی میں کیا پتہ چلتا ہے کہ کون ہے.. اور کون نہیں ہے..

وہ گھوڑے کو بھول گئے اور جانی کے بارے میں فکر مند ہوگئے..

اُن سب کے دماغوں میں فتور بھرا تھا.. یہ فتور نہ ہوتا تو وہ یہاں نہ ہوتے اپنے اپنے گھروں کی آسائش میں ہوتے.. اس لیے کسی کو بھی سمجھایا نہ جاسکتا تھا صرف اُس کے بارے میں فکر مند ہوا جاسکتا تھا..



نیچے اپنے گھر میں پہنچ کر وہ بہت دیر تک نابینا رہے تھے.. ہاتھ بڑھاتے ایک دوسرے کو چھوتے بھٹکتے رہے تھے اور پھر آہستہ آہستہ اُن کی بینائی لوٹ آئی تھی اور اب وہ ایک دوسرے کی پہچان کر سکتے تھے.. اور انہیں پہلی بار احساس ہوا کہ جانی ان میں نہیں ہے..

"میں اُس کا پتہ کرتا ہوں.. وہ ہم سے زیادہ بہک گیا ہے" ابو طالب چی چی تہہ خانے کے ایک کونے میں گرا ہانپ رہا تھا.. قلعہ جنگی کے صحن میں چلتے چلتے وہ اپنی ہمت صرف کر چکا تھا.. پھر بھی اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی..

"نہیں.. میں جاتا ہوں" عبدالوہاب کے زخم اور بھوک اُسے کچوکے دیتے تھے پھر بھی اُس نے اُٹھنے کا چارا کیا..

"یارا میں اُس کو آواز لگاتا ہوں.." گل شیر نے انہیں تسلی دی "شائد وہ بھول گیا ہے کہ اُسے ادھر اس تہہ خانے میں اُترنا ہے اس لیے مارا مارا پھرتا ہے"

"نہیں گل شیر.." عبدالوہاب ہراساں ہوگیا"... آواز بلند نہیں کرو.. کوئی نہ کوئی سن لے گا.. نہیں.."

"کیا بات کرتا ہے عرب بھائی.. ادھر صرف لاش لوگ پڑا ہے اور اُس کا کان نہیں سنتا.. جو کان سنتا ہے وہ اُدھر نیچے مزار شریف میں یہاں سے بہت دور ہے.. اور وہ خانہ خراب موسیقی سنتا ہے.. او جانی.."

گل شیر کی پکار نے پورے تہہ خانے کو بھر دیا وہ اتنی بلند تھی.. او جانی.. اور پھر وہ اس تہہ خانے میں سے ایک مرغولے کی طرح گھومتی نکلی اور جانی تک جا پہنچی جو قلعہ جنگی کے صحن میں بکھری لاشوں کے میلے میں ایک گمشدہ بچّے کی مانند پریشان گھومتا تھا کہ اب کدھر جائے.. گھر کا راستہ کہاں ہے.. ماں باپ کا دست شفقت کہاں ہے اور واقعی وہ مکمل طور پر فراموش کر چکا تھا کہ وہ کہاں سے آیا تھا.. کیوں آیا تھا.. اور اب اُسے کہاں جانا ہے.. نہ اُسے اپنی گزشتہ زندگی یاد رہی

تھی اور نہ اُسے حال کی ابتلا کا کچھ پتہ تھا اور اس گمشدگی اور فراموشی کے عالم میں "او جانی" کی پکار نے جیسے اُسے مدہوشی میں سے جھٹک کر ہوش تک پہنچا دیا اور اُسے احساس ہوا کہ اُس کے ساتھی اور گھوڑا جا چکے ہیں اور وہ پیچھے رہ گیا ہے.. وہ اپنے موجود کو پہچان کر اس "او جانی" کی پکار کے تنے رسّے پر چلتا ہوا گل شیر ولی تک چلا گیا.. لاشوں کو بے دھیانی میں ٹاپتا کبھی کسی تنہا ہاتھ کی ہتھیلی پر قدم دھرتا اور کبھی اپنے خول سے بہہ چکی بینائی والی آنکھوں پر بُوٹ جماتا.. اُن آنکھوں کو جھک کر "سوری" کہتا گل شیر ولی تک چلا گیا..

"آئی ایم سوری.. مجھے پتہ نہیں کیا ہو گیا تھا جو میں پیچھے رہ گیا"

"یارا ہم سب کو بھی کیا پتہ کہ کیا ہو گیا ہے.." گل شیر نے اُس کے دُکھے ہوئے بدن کو اپنی آغوش میں سمیٹ کر اپنی آنکھوں میں اُترتی نمی کو سنبھالا دیا "آؤ.. نیچے چلو"

جانی اور گل شیر.. میلے میں کھوئے گئے بچے.. کچھ شرمندہ.. کچھ مجرم محسوس کرتے ہوئے سر جھکائے تہہ خانے میں اُترنے لگے..

کورم پورا ہو گیا..

سب کے سب اپنی قبر میں موجود تھے..

وہ بھی.. اور گھوڑا بھی..

گھوڑا شائد اُن کے مجتمع ہونے کا ہی منتظر تھا..

اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں.. جب کہ جانی اور گل شیر کے سوا سب کی بینائی لوٹ آئی تھی.. گھوڑا ابھی تک نابینا تھا..

نہیں جانتا تھا کہ اُس کی پشت اور پسلیوں پر جمے ہاتھ اُسے کہاں لے آئے ہیں.. لائے ہیں تو کیوں لے آئے ہیں..

وہ ان سب کے ہاتھوں اور لمس سے نا آشنا تھا..



وہ کبھی بدخشاں کی لعل و جواہر کی کانوں کے آغوش میں پھیلے ایک وسیع اور بے دریغ سبزہ زار میں بگٹٹ بھاگتا تھا اور اُس کے سموں تلے جو سرد گھاس دبتی جاتی تھی اُس کی سردی کا باعث اس میدان کے کناروں پر اُبھرتی برف آلود چوٹیاں تھیں.. اور وہ بے سوار بگٹٹ بھاگتا تھا.. پھر اُس کی پسلیوں کے گرد ایک جنگجو کی ٹانگیں قوس ہوئیں اور وہ اُسے بدخشاں سے بھگاتا ہوا قندوز اور مزار شریف تک لے آیا.. اُس کے لمبے کانوں میں اس سے پیشتر صرف امن اور خاموشی تھی.. اور اب اُس کا سوار اُسے دھماکوں اور گولیوں کی بوچھاڑ میں بھگاتا تھا..

یہیں کہیں مزار شریف کے آس پاس.. اُس کا سوار کسی غیر ملکی طالبان کا نشانہ بن کر اُس کی پشت پر سے گرا تھا.. اور اُس طالبان کی زد میں اُس کی پچھلی ایک ٹانگ بھی آئی تھی اور وہ ایک گولی ابھی تک وہیں اُس ٹانگ میں ٹھہری ہوئی تھی اس لیے وہ لنگڑاتا تھا..

اور وہ کئی روز سے بھوکا اور پیاسا تھا.. زخم خوردہ تھا.. اور اپنی پیاس بجھانے کی خاطر قلعہ جنگی کی لاشوں کو چاٹتا تھا کہ بے وقوفی میں خواہ مخواہ ہنہنا دیا تھا اور وہ اپنے تہہ خانے میں اُس کی خبر پا کر اُس تک آ گئے تھے اور اُس کی مٹی میں گھسٹتی باگیں تھام کر اسے اس تاریکی میں لے اُترے تھے..

وہ ان سب کے ہاتھوں اور لمس سے اگرچہ نا آشنا تھا.. لیکن اُن میں صرف ایک ہاتھ ایسا تھا جس نے اُس کی پیٹھ کو تھپکا تھا تو وہ جان گیا تھا کہ صرف یہ شخص جانتا ہے کہ ایک گھوڑے کی پیٹھ کو کیسے تھپکا جا سکتا ہے۔

وہ شخص اور گل شیر.. میلے میں کھوئے گئے بچے.. کچھ شرمندہ.. کچھ مجرم محسوس کرتے سر جھکائے تہہ خانے میں اُتر آئے تھے..

گھوڑے نے نتھنے پھلا کر آہستہ سے ایک پھُرر پھُرر سی آواز نکال کر اُس شخص کی موجودگی کو پسند کیا جو یہ جانتا تھا کہ ایک گھوڑے کی پیٹھ کو کیسے تھپکا جاتا

ہے.. لیکن وہ ابھی تک نابینا تھا.. وہ اس ناآشنا گھپ اندھیرے میں بے قرار اور بے چین ہونے لگا.. وہ یا تو دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کہاں ہے اور یا پھر یہاں سے نکل کر اُس کھلے میدان میں واپس جانا چاہتا تھا جہاں سے اُسے لایا گیا تھا.. مضطرب اور خوفزدہ حالت میں وہ گردن اکڑا کر زور سے ہنہنایا.. یہ ہنہناہٹ تہہ خانے کی چھت اور دیواروں سے ٹکراتی گونجنے لگی اور لمحہ بھر کے لیے یوں لگا جیسے ایک نہیں درجنوں گھوڑے ہنہنا رہے ہوں.. وہ سب اپنے اپنے مقام پر گھبراہٹ میں آگئے کہ ابھی گل شیر کی "او جانی" نے اُنہیں دریافت کے خوف میں مبتلا کیا تھا اور اب یہ ہنہناہٹ تہہ خانے سے نکل کر اُن کی موجودگی کی تشہیر کرنے پر قادر تھی.. وہ گھوڑے کو اس ناواجب حرکت پر ڈانٹ بھی نہیں سکتے تھے اس لیے چپ بیٹھے رہے تا آنکہ وہ ہنہناہٹ سیڑھیوں کے راستے تحلیل ہوتی یکسر خارج ہو گئی.. گھوڑے کی گھبراہٹ کو افاقہ نہ ہوا اور اُس کا پیٹ پچکنے لگا اور وہ پیشاب کرنے لگا جس کی گرمی تہہ خانے کے کچے فرش کو بھگوتی اس میں سے ہلکی بھاپ بلند کرنے لگی.. اُس کی لید بھی خارج ہونے لگی..

جانی نے سب سے پہلے اس اخراج کو ہوا میں محسوس کیا.. وہ اپنے ذاتی پونی براؤنی کی اس حالت سے آگاہ تھا.. جانی کے زخموں کا بھی.. کوئی شمار نہ تھا گہری خون آلود خراشوں کی کوئی گنتی نہ تھی.. وہ اندھیرے کو ٹٹولتا ہوا آگے ہوا اور گھوڑے کی پچھلی ٹانگوں کو تھام کر کچے فرش میں ابھی تک جذب نہ ہونے والے گرم پیشاب پر لیٹ گیا اور اُس کی گرمی کو اپنے دُکھتے سرد بدن کے ہر حصے میں جذب کرنے کی کوشش میں فرش پر لوٹنے لگا..

جہاں جہاں پیشاب کی گرم حدّت بدن میں اثر کرتی وہاں راحت اور سکون کے نئے دروازے کھلتے جاتے..

ہاشم کو بہت دیر بعد سجھائی دیا کہ وہ کیا کر رہا ہے "جانی.." اُس نے جھک



کر اُس کے شانے کو گرفت میں لیا "کیا کر رہے ہو؟"

"تم لوگ بھی ایسا ہی کرو ہاشم.. تم سب کے لیے یہ پیشاب بہت ہے.. یہ اینٹی سیپٹک ہے.. اس میں اپنے بدن کو ڈبو دو.. جلدی کرو ورنہ یہ ٹھنڈا ہو جائے گا.."

"یار یہ امریکی مسلمان تو ہے پر.. گندا بہت ہے" گل شیر نے اُس کی اس حرکت کو پسند نہ کیا.. "ہمارا باپ اصطبل میں کام کرتا تھا پر مجال ہے گھوڑے کا پیشاب کا ایک چھینٹا بھی اپنے اوپر پڑنے دیتا تھا.. وضو ٹوٹ جاتا ہے یارا"

جانی نے جواب نہ دیا پیشاب پر لوٹتا رہا... اور کوئی بھی اس نسخے کو آزمانے پر مائل نہ ہوا..

"ویسے جانی ٹھیک کہتا ہے.. ہمارے زخم ہمارے اعضا کو مردہ کر رہے ہیں.. مواد آلود کر رہے ہیں.. فساد خون کا باعث بن رہے ہیں اور پیشاب اس فساد کو روک سکتا ہے"

"لعنت بھیجو یارا.. فساد ہو جانے دو کیا فرق پڑتا ہے.."

گھوڑے نے لید بھی کر دی تھی.. لیکن جانی اُس سے دور رہا..

پیشاب کی گرمی لمحوں میں زائل ہو گئی اور وہ تہہ خانے کی فضا جتنا ہی ٹھنڈا ہو گیا.. فرش کا کیچڑ سخت اور سرد ہونے لگا.. جانی کا بدن کپکپانے لگا اور وہ گھسٹتا ہوا اپنے کونے میں جا بیٹھا.. بہت دنوں کے بعد اُس کی ٹیسیں قدرے کم ہوئی تھیں اور وہ اس وقتی آرام میں اونگھنے لگا..

"ہم گھوڑے کو اس مقصد کے لیے یہاں نہیں لائے.." ابو طالب چی چی کہیں سے بولا....

کسی نے بھی کچھ نہ کہا.. سب جہاں جہاں تھے نڈھال حالت میں چپ بیٹھے رہے..

"گھوڑے کو کون مارے گا؟" چی چی نے کہا..

گھوڑا ابھی تک ایک کھیلنے کی چیز تھا..

ایک کھیل تھا..

عید قربان کے بکرے کی مانند.. لاڈ پیار کے لیے تھا. کھیلنے کے لیے تھا..

اور پھر یکدم اُس کے گلے پر چھری پھیر دینے کا لمحہ آ گیا تھا..

"اسے آج کی رات رہنے دیں چی چی.. جو کرنا ہے کل کر لیں گے.." ہاشم نے لجاجت سے اندھیرے کو مخاطب کر کے کہا..

"اگر وہ ابھی تک ادھر نہیں آئے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کبھی نہیں آئیں گے.. لاشوں کی بُو جب مزار شریف کے گھروں میں بچھی چادروں میں سے بھی آنے لگے گی تو وہ ادھر آئیں گے لاشیں اُٹھانے اور اُنہیں ٹھکانے لگانے کے لیے.. ہو سکتا ہے وہ کل صبح ادھر آ نکلیں اور اُن کی آوازیں سن کر گھوڑا تو ہنہنائے گا.."

"کل اور آج ختم نہیں ہو گئے.. ہو سکتا ہے کل نہ آئے.."

"اگر آ گئی تو.. جیسے آج آ گیا تھا.."

"ویسے چی چی.. گھوڑا پُر سکون ہو چکا ہے.. کچھ مانوس ہو چکا ہے.. کیا حرج ہے اگر ہم اسے کل تک کچھ نہ کہیں.."

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں.." چی چی ناراض ہو گیا "تم سب بے شک اس پر سوار ہو کر اس وقت قندھار چلے جاؤ مجھے کیا اعتراض ہے.."

سب نے اُس کی ناراضگی کو محسوس کیا..

تہہ خانے سے وہ نکلے تھے۔ گرتے پڑتے ٹھوکریں کھاتے اپنی ہمت سے کہیں بڑھ کر اپنی بچی کھچی سکت جمع کرتے وہ صرف گھوڑے کے حصول کے لیے..



اُسے ہلاک کر کے اپنی بھوک مٹانے کے لیے تہہ خانے میں سے نکلے تھے.. لیکن اُن چند لمحوں میں جب اُس کی باگ تھامے.. اُس کے آس پاس چلتے.. قلعہ جنگی کے صحن کی مکر چاندنی میں چلتے واپس تہہ خانے میں اُترے تھے تو اُن لمحوں میں وہ یکسر بھول گئے تھے کہ اس جانور کے حصول کا اصل مقصد کیا ہے اور وہ اُنہیں قربانی کے بکرے کی مانند عزیز ہو گیا تھا اور اُن میں اُس کے گلے پر چھری چلا دینے کا حوصلہ نہ تھا۔

"بھائی جی.. میری انتڑیاں بھوک سے خشک ہو کر گچھا مچھا ہو گئی ہیں.. ہاں جی.. کل تک انتظار نہیں کر سکتیں.. جو کرنا ہے آج ہی.. ابھی کر لو.. نہیں تو کل تک میں نہیں نکالتا.." اللہ بخش کی آواز میں اتنی نقاہت تھی کہ وہ بار بار کھانستا اور اٹکتا تھا..

"ہاں... ہاں." عبدالوہاب نے صرف اتنا کہا..

"گھوڑے کو کون مارے گا؟" چی چی نے نہیں مرتضیٰ نے کہا"... تم گل شیر.."

"نہیں یارا.. ہمارا طبیعت خراب ہے.. کلاشنکوف چلانے کو جی نہیں چاہ رہا.. ورنہ ہمارا لوگ تو انسان کو بے دریغ مارتا ہے جانور کیا چیز ہے.."

"بہانے نہیں بناؤ خاں صاحب.. گھوڑوں کے بارے میں تمہارا تجربہ بہت وسیع ہے.. تمہارا باپ بھی تو نواب کے بیمار گھوڑوں کو ہلاک کرتا ہو گا تو تم بھی کر سکتے ہو"

"وہ تو نواب خود اپنے ہاتھ سے مارتا تھا.. پرائیویٹ جا کر مارتا تھا کہتا تھا کہ ہمارا گھوڑا عزت دار جانور ہے اسے اصطبل میں لید صاف کرنے والا لوگ نہیں مارے گا.. چی چی برادر بولتا تھا کہ گھوڑے کو مارو تو وہ خود مار لے.."

چی چی کی جانب سے کوئی جواب نہ آیا..

"بولو چی چی.."

"مرتضٰی بیگ اُدھر ہمارے چیچنیا میں گھوڑوں کو اولاد کے برابر درجہ دیتے ہیں بلکہ اُس سے بھی بلند.. اولاد کو مارنا مشکل ہوتا ہے.. کوئی اور بے شک مار دے خود مارنا مشکل ہوتا ہے.. عبدالوہاب کو بولو.. یہ بدّو لوگ عادی ہوتے ہیں.."

عبدالوہاب بھی چپ رہا جب تک مرتضٰی نے اُس سے نہ کہا کہ.. بولو عبدالوہاب..

"اخی چی چی کہتا ہے کہ اُن کے ملک میں گھوڑا اولاد کے برابر ہوتا ہے.. لیکن ایک عرب کے لیے گھوڑا عزت نفس ہوتا ہے.. ہم حسینؓ کو شہید کر دیتے ہیں لیکن اُس کے گھوڑے کو گزند نہیں پہنچاتے.."

"بھائی مجھے آزمائش میں نہ ڈالنا.." اللہ بخش جان گیا کہ اب شائد اُس کا نام پکارا جائے "مجھے پتہ ہی نہیں کہ گھوڑے کو کیسے مارتے ہیں.."

"تاریکی میں صرف لبلبی دبانی ہے کلاشنکوف کی نالی اُس کی جانب کر کے.. اور بس.."

"تو تم کر لو.."

گھوڑا جیسے مقدّس ہو گیا تھا..

"اگر میں کر سکتا تو تم لوگوں کی منت سماجت کیوں کرتا.." پشیمانی مرتضٰی کے آواز میں معافی کی خواستگار ہوتی تھی "جانی.. عبدالحمید سلمان الفارسی.. تم.."

"نہیں.." جانی نے صرف اتنا کہا..

"کیوں نہیں.."

"آئی لَو ہارسز.. آئی کینانٹ شُوٹ ہارسز.." جانی اپنی مختصر اردو بھول گیا اور بھڑک کر اپنی امریکی انگریزی میں رواں ہو گیا..



"تم انہیں وہاں.. میری لینڈ واشنگٹن میں.. یا شمالی کیلیفورنیا میں.. جب یہ بوڑھے یا ناکارہ ہو جاتے ہیں.. زخمی ہو جاتے ہیں تو تم انہیں شوٹ کر دیتے ہو ناں.. یہ گھوڑا بھی ناکارہ اور زخمی ہے.. تو اسے شوٹ کر دو"

"نو.. آئی کینانٹ.." جانی کو محسوس ہوا کہ وہ نرغے میں آ گیا ہے..

"وہائی ناٹ.." .. تم نے بہت سے انسانوں کو شوٹ کیا ہے بے دریغ اور کسی بھی احساس جرم کے بغیر.. اور یہ جاننے کے بغیر کہ جسے تم شوٹ کر رہے ہو اُسے شوٹ کرنے سے تمہارے تصوّر کامل کو کچھ تقویت ملے گی بھی یا نہیں.. وہ معصوم ہے.. اس احساس جرم کے بغیر تو.. ایک جانور کو اپنی بھوک مٹانے کی خاطر ہلاک کرنے سے کیوں جھجکتے ہو.."

"اس لیے ڈیم اِٹ.." جانی ہسٹریائی کیفیت میں چیخنے لگا "اس لیے کہ جنگ ہم کرتے ہیں اپنی من مرضی.. اپنے آدرش اور اپنی جنت کے حصول کے لیے.. گھوڑے تو نہیں کرتے.. ہم ان کی پشت پر سوار انہیں جنگ کی جانب دھکیلتے ہیں.. ان میں ان کی مرضی شامل نہیں ہوتی.. اس لیے یہ معصوم.. بے گناہ اور مجبوری کی حالت میں دھکیلے جانے والے ہوتے ہیں.. میں انہیں شوٹ نہیں کر سکتا.. آئی کینانٹ!"

"کم آن جانی.. یو کین ڈُو اِٹ.." ہاشم میر نے ہلا شیری دی۔

"آئی کینانٹ.."

"ہم پر وہ وقت آنے والا ہے جانی.. جب ہم اِس گھوڑے کو زندہ کھا جانے کے بارے میں سوچنے لگیں گے.. اپنی تمامتر گھوڑا اخلاقیات.. کہ یہ ہمیں اولاد سے بھی زیادہ عزیز ہے.. ہماری عزّت نفس ہے... ہم یہ سب بکواس بھول کر اپنی بھوک اور پیاس کے سامنے سرنگوں ہو کر اسی گھوڑے کی پشت پر اپنے دانت گاڑھ کر منگولوں کی مانند اس کا خون پینے لگیں گے.. ہم پر وہ وقت آنے والا ہے..

ابھی ہم میں کچھ سکت باقی ہے.. اگر اب ہم اسے ہلاک کر کے اس کا گوشت نہیں نگلتے تو کل تک.. اگر کل آئی تو.. ہم اتنے لاغر اور لاچار ہو چکے ہوں گے کہ اسے مارنے کے لیے ہماری اُنگلیوں میں کلاشنکوف کی لبلبی بھی نہیں دبائی جائے گی.. کم آن جانی.."

"وہائی ڈُو یو پک آن می.." جانی نقاہت کے باوجود چیخ اُٹھا "میں ہی کیوں؟.. تم میں سے کوئی ایک کیوں نہیں.. ایک سے ایک بڑھ کر جری اور سورما ہو تم کیوں بہانے بنا رہے ہو.. میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ میں ایک گھوڑے کو کبھی نہیں مار سکتا.. آنکھیں بند کر کے بھی اُس پر فائر نہیں کر سکتا کیونکہ وہ فائر میرے دل میں لگے گا اُس میں چھید کر دے گا.. میں نہیں کر سکتا.. تم ہم سے کہتے ہو مرتضیٰ.. خود کیوں نہیں مار دیتے.."

"میں.." مرتضیٰ ٹھٹک گیا "میں؟"

"ہاں تم... مجھے معلوم ہے کہ تم لوگ گھوڑوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہو.. میں نے دیکھا ہے کہ تم اُنہیں بیدردی سے پیٹتے ہو.. اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ وہ لاغر ہوتے ہیں اُن کی پیٹھ مار پیٹ کے زخموں سے بھری ہوتی ہے اور تم اُن پر بوجھ لاد کر اُنہی زخموں پر چابک برساتے ہو.."

"اور تم نہیں کرتے؟"

"نہیں ہم گھوڑوں سے پیار کرتے ہیں.. تم لوگ نہیں کرتے.."

"ہم؟... واہ... ابھی تک تمہارا نسلی غرور ختم نہیں ہوا امریکی.. تم ابھی تک "ہم" ہو اور ہم اب بھی "تم لوگ" ہو.. رنگ و نسل کے جھگڑے ختم نہیں ہوئے.." مرتضیٰ کی کڑواہٹ عروج پر تھی..

ہاشم اس جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن وہ مرتضیٰ کی کڑواہٹ سے فکر مند ہوا' یہ کوئی وقت اور مقام نہ تھا اس قسم کی بحث کا "دیکھو مرتضیٰ.. بلکہ اپنے



کان کا رُخ اس جانب کرو جدھر میں دیوار سے لگا بیٹھا ہوں... جانی کا نقطۂ نظر سمجھنے کی کوشش کرو.. میں تو اُس کی کیفیت کو آسانی سے سمجھ رہا ہوں لیکن تم بھی کوشش کرو.. مغرب کے لوگ جانوروں کے لیے ایک نرم گوشہ رکھتے ہیں اُن سے بے جا ہی سہی بہت پیار کرتے ہیں... میں اُن کے درمیان میں پلا بڑھا ہوں اور اُن کے احساسات سے آگاہ ہوں.."

"ہاں تم تو سمجھ سکتے ہو.. اُن کے احساسات سے آگاہ ہو سکتے ہو ہاشم میر.. کیونکہ تم بھی تو ایک الگ نسل کے ہو.." مرتضیٰ بے وجہ جوش میں آگیا.. "بلکہ اُنہی کی نسل سے ہو.. انگلینڈ میں پیدا ہوئے' بے شک تمہارے ماں باپ پاکستان سے گئے لیکن تم تو وہاں کے جم پل ہو اُنہی کے رنگ میں رنگے ہوئے.. اسی لیے اُن کی اخلاقی قدروں پر یقین رکھتے ہو.. انسان کو مار دو لیکن گھوڑے کو مت مارو.."

"آئی ڈونٹ نیڈ اے سرٹیفکیٹ فرام یو مرتضیٰ. آر اینی وَن ایلس" ہاشم بھی اُبلنے لگا "میں نے جو کچھ قربان کیا ہے تم اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے.."

"ہم پر احسان کیا ہے؟"

"نہیں.. میں نے کسی کے لیے بھی کچھ نہیں کیا جو کیا ہے اپنے لیے کیا ہے... جس کاز پر یقین رکھتا ہوں اُس کے لیے کیا ہے اور مجھے کوئی شرمندگی نہیں ہے.."

"تمہیں صرف ایک مسلمان ہونے کی نسبت ایک برٹش موزلم ہونے پر زیادہ فخر ہے.."

"ہاں اِس میں حرج کی کوئی بات نہیں.. برطانیہ میرا وطن ہے اور مجھے اس پر فخر ہے.. لیکن میں نے ایک پر آسائش امن کی زندگی ترک کی ہے.. تم نے کیا ترک کیا ہے اِس کاز کے لیے.. غربت' بھوک اور.."

"ایسانہ کرو برادر... ایسانہ کرو.." چی چی کی آواز رُندھی ہوئی تھی "ہم میں آج تک.. پچھلے تین روز سے کوئی اختلاف نہیں ہوااور واقعی نہ یہ مقام ہے اور نہ وقت... یہاں اس تہہ خانے کی قبر میں ہم کتنی سانسیں اور جئیں گے.. دو تین دن شائد.. یاشائد کل صبح تک ہم مرے پڑے ہوں.. اور تم آپس میں جھگڑا کرتے ہو.. ایسانہ کرو برادر.."

"لیکن چی چی بھائی.. ہاشم ہمیشہ جانی کے قریب رہتا ہے.. آپس میں انگریزی بولتے ہیں.. اور ہم سے الگ رہتا ہے.."

"اس لیے اللہ بخش کہ.. ہم دونوں میں بہت کچھ مشترک ہے.. تم میں اور مجھ میں عقیدے اور رنگ کی سانجھ تو ہے لیکن میں کیا کروں میرے اور تمہارے درمیان اور کچھ بھی مشترک نہیں.. میں مجبور ہوں کہ میں جانی کو اور وہ مجھے بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے.. ہم دونوں ایک ہی ثقافتی ماحول کی پیداوار ہیں.. ایک دوسرے کے مزاج کو.. حس مزاح کو سمجھ سکتے ہیں.. اور اگر ایسا ہے تو اس میں تم بتاؤ کہ کیا حرج ہے؟"

"کوئی حرج نہیں.." مرتضیٰ کا زہر کم نہیں ہو رہا تھا "مجھے یہ بھی علم ہے کہ اگر کسی معجزے سے ہم زندہ بچ گئے اور پکڑے گئے تو جانی.. تمہارے بہت سے حقوق ہوں گے جو امریکی آئین تمہیں دیتا ہے اور ہاشم.. تم برطانوی شہری ہو.. اور برطانوی حکومت تمہیں بھی تنہا نہیں چھوڑے گی.. اور ہم تینوں.. میں‘ گل شیر اور اللہ بخش.. ہماری حکومت تو ہماری گردنوں میں رسّی ڈال کر گھسیٹتی ہوئی ہمیں اپنے آقا کے قدموں میں ڈال دے گی.. کہ سَر.."

"پلیز.. یہ کیا ہو رہا ہے.." جانی کی شکل دکھائی نہیں دیتی تھی لیکن اُس کی آنکھوں میں یکدم جو نمی اُتر آئی تھی وہ تاریکی کو مزید دھندلانے لگی "پلیز.. ہم سب جان بوجھ کر ایک ہارنے والی بساط کے مُہرے بنے ہیں.. کیونکہ ہم باقی دنیا کی



مانند ایک نامرد اور بیکار زندگی نہیں گزار سکتے تھے اپنے آئیڈیل پر ایمان رکھتے تھے.. ہم میں سے کچھ ایسے بھی ادھر آئے جو ملّاؤں کے مکر اور سحر میں اندھے ہو کر ادھر آگئے اور یہاں پہنچ کر اُن پر کھلا کہ ان کے ساتھ کیا کھیل کھیلا گیا ہے اس لیے کہ ملّا پیچھے رہ گئے.. احتجاجی جلوس نکالنے اور چندے جمع کرنے کے لیے.. لیکن ہم میں سے بیشتر اپنے اپنے شعور کے تابع ایک پروقار موت کے لیے اپنے پورے ہوش و حواس کے ساتھ ادھر آئے تھے.. ایک بڑے تصوّر کے لیے جدوجہد کرنے والے اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے کا گریبان نہیں پکڑتے.. رنگ و نسل اور شہرت کے طعنے نہیں دیتے.. مرتضیٰ اگر امریکی آئین کے تحت دیئے جانے والے حقوق کا مجھے اتنا ہی چاؤ ہوتا تو میں اپنے ماں باپ‘ گھر بار اور اپنے آبائی عقیدے کو ترک کر کے مرنے کے لیے ادھر آجاتا.. تمہارے طعنے اور دشنام سننے.. اس سے بہتر تھا کہ میں کشمیر میں ہی شہید ہو جاتا..."

"تم.. کشمیر میں بھی تھے؟" مرتضیٰ کی کڑواہٹ یکلخت حیرت میں بدلی..

"ہاں.. میں وہاں ایک امریکی ٹورسٹ کے بھیس میں گیا تھا.. بھیس میں کیا میں تھا ہی امریکی.. اور کسی نے مجھ پر شک نہ کیا.. تب میں یمن سے عربی سیکھ کر آیا تھا لیکن مجھے اردو بھی بہت تھوڑی آتی تھی.. مجھے وہاں جو ساتھی ملے اُن سے تو میں بات بھی نہیں کر سکتا تھا.."

"سوری جانی.. پلیز فارگو مِی.." مرتضیٰ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا جدھر جانی تھا اُدھر گیا اور اُس کے بھوک اور زخموں سے مسمار ہوتے بدن کو آغوش میں لے لیا "سوری جانی.. ہم سب وہ تو نہیں رہے جو کبھی نارمل انسانوں کی طرح تھے کچھ اور ہوگئے ہیں.. رنگ و نسل کے تعصّبات زائل نہیں ہوتے اور ہمیں شرمندہ کر دیتے ہیں.. میں بھی شرمندہ ہوں اور میں جانتا ہوں کہ ہم سب میں سے تم نے بہت کچھ گنوایا ہے.. اپنے عقیدے‘ اپنے ماں باپ اور وطن کو ترک کیا ہے.. میں

تمہاری قدر کرتا ہوں.. سوری جانی"

"فارگٹ اِٹ مرتضٰی.. اِٹ ہیپنز.."

"اور ہاشم میر.. میں تم سے بھی شرمندہ ہوں.. سوری.." وہ اُس کے قریب نہیں گیا اُدھر جانی کے پاس سے ہی بولا..

"لو جی یہ تو بہت ہی اچھا ہوا.. بھائیوں کی صلح ہو گئی ہے.." اللہ بخش کے تنے ہوئے اعصاب پرسکون ہو گئے "ویسے بھائی مرتضٰی.. ہاشم کہتا تو ٹھیک ہے ناں.. ہمارے گاؤں کے بہت سارے لڑکے یورپ اور ولیت سمگل ہوئے.. کچھ بڑے بڑے ٹرکوں میں چھپ کر گئے تو سانس بند ہونے سے مر گئے گچھا مچھا ہو کر.. کچھ ڈوب مرے پر جو پہنچ گئے ہیں اُن کی تو موجیں ہو گئیں پونڈوں کے ڈھیر کمائے اُنہوں نے.. ہم سب اُن کے نصیب پر رشک کرتے تھے.. میرے پاس بھی کچھ رقم ہوتی تو میں بھی کوشش کرتا بے شک مر جاتا.. رقم نہیں تھی تو مدرسے میں جا بیٹھا.. تو جو بندہ وہاں کا ہو.. جم پل ولیت کا ہو تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے یہاں آ جائے شہید ہونے کے لیے تو بڑی بات ہے جناب عالی.. کم سے کم مجھے تو واقعی نہیں پتہ کہ ہاشم کیا کیا عیش چھوڑ کر آیا ہے.."

کڑواہٹ اُن کے درمیان میں سے رخصت ہو گئی..

وہ باتیں کرتے رہے.. گلے شکوے کے غصیلے.. عمر کی نادانی کے کچے بہاؤ میں بہتے بہتے وہ کنارے سے آ لگے تھے اور شرمندہ تھے اور تہہ خانے کی تاریکی میں فرش کے مختلف حصوں میں پڑے تھے' دیواروں کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور باتیں کرتے تھے..

صرف گھوڑا تھا جو کھڑا تھا..

خاموش تھا.

اور منتظر تھا..



اور پھر کچھ مدت بعد وہ باتیں تو کرتے تھے لیکن یہ نقاہت بھی تھی اور قربت مرگ کی مُردنی بھی تھی کہ اُن کی آواز لبوں سے باہر آتے آتے دم توڑ دیتی تھی.. ظاہر نہیں ہوتی تھی..

اُن کے لب ہلتے جاتے تھے.. لیکن تہہ خانے میں بھرپور سکوت ٹھہر چکا تھا.. وہ اپنے تئیں بول رہے تھے لیکن اُن کی آواز نہیں نکل رہی تھی..

اس زیرزمین آماجگاہ میں قلعے کا سٹور ہوا کرتا تھا.. وہ تو کب کا خالی کیا جا چکا تھا.. جو بھی اسلحہ یا خوراک یہاں سٹور کی گئی تھی وہ قندوز اور مزار شریف میں کام آ چکی تھی.. اب یہاں کچھ خالی کارٹن.. بوتلیں۔ پرانی شلوار قمیضیں کہ شمالیوں کو روسیوں نے نئی نکور وردیاں پہنا دی تھیں اور نیلے رنگ کے کچھ خالی ڈرم پڑے تھے..

وہ ہمیشہ سے تو اس قبر میں نہیں تھے..

یہ محض ایک اتفاق تھا.. اسے نصیب بھی کہا جا سکتا ہے جس نے اُنہیں اس تہہ خانے میں دھکیل دیا اور وہ ایک دوسرے کے وجود سے آگاہ ہوئے..

مزار شریف میں ہتھیار ڈالنے کے بعد وہ اُنہیں ہانکتے ہوئے قلعہ جنگی میں لے آئے تھے.. اور پھر اُن کی مشکیں کسی جانے لگیں.. پشت پیچھے ہاتھ باندھے جانے لگے تو وہ نروس ہو گئے.. وہاں دو غیر ملکی ٹیلی ویژن ٹیمیں بھی موجود تھیں جن کے کیمرے اُن پر تھے.. وہ ہراساں ہو گئے کہ اب اُنہیں اجتماعی طور پر قتل کیا جانے لگا ہے کہ روائت یہی تھی اور جن کے ہاتھ ابھی بندھے ہوئے نہیں تھے اُنہوں نے بغاوت کر دی.. شمالیوں کو اس کی توقع نہیں تھی وہ تو اُنہیں فتنہ پروری سے روکنے کے لیے باندھ رہے تھے.. اُن کے قتل کا فیصلہ ابھی نہیں ہوا تھا لیکن وہ حواس کھو بیٹھے اور جن کی تلاشی مکمل نہیں ہوئی تھی وہ اپنے ہتھیار نکال کر فائر کرنے لگے.. دوستم کا پولیس چیف اُن کا نشانہ بن گیا... ایک

امریکی سی آئی اے کے ایجنٹ کے پرخچے اڑ گئے اور پھر ان پر بی-52 کا عتاب نازل ہو گیا.. قلعے کی دیواروں میں نصب مشین گنوں نے جو کچھ ان کے بس میں تھا سب کا سب اُگل دیا.. ڈیزی کٹر اور بنکر بسٹر آسمان سے نازل ہونے لگے اور کچے صحن میں مٹی کے آتش فشاں اُبل کر اُنہیں زندہ دفن کرتے گئے.. یہ قیامت تو نہیں تھی پر قیامت سے کم نہ تھی.. بلکہ زیادہ تھی.. وہ رزق خاک تھے سو خاک ہوئے.. یہ کھیل تماشہ صرف چند لمحوں کا تھا اور پھر ختم ہو گیا..

قلعہ جنگی کے صحن کے اُوپر ایک غبار معلق تھا.. اُس غبار تلے سینکڑوں لاشے تھے.. جان بے شک شہادت سے نکلے مشکل سے نکلتی ہے.. موت یہ نہیں پرکھتی کہ یہ جنت کا آرزومند ہے یا کافر ہے یا منکر ہے وہ اپنی اذیت کم نہیں کرتی.. جان بیلنے میں آئے ہوئے گنے کی مانند ہی نچڑتی ہے.. جن کے بدن نسبتاً سلامت رہے تھے وہ پورے کے پورے پھڑک رہے تھے اور جو اتنے خوش قسمت نہیں تھے اُن کے اعضاء ٹھنڈے نہیں ہوتے تھے اور وقفوں وقفوں سے تھرتھراتے تھے..

اب بھگدڑ میں اُنہیں کوئی جائے پناہ نظر نہ آتی تھی اور پھر اس تہہ خانے کی پہلی دو سیڑھیاں نظر آئیں.. وہ اس میں باری باری گرتے گئے.. اور اُنہیں یہی گمان ہوا کہ وہ مر چکے ہیں اور موت کی تاریکی میں گر رہے ہیں..

رات کا کوئی پہر تھا جب چاندنی دوسری سیڑھی پر اُتری تو ہر ایک آگاہ ہوا کہ وہاں اُس کے سوا کوئی اور بھی ہے..

یہ نہیں کہ وہ بچ کر آ گئے تھے.. اپنے بدنوں میں براجمان گولیوں اور بموں کے آہنی ٹکڑوں کو بھی ساتھ لائے تھے.. اور کئی روز کی بھوک اور پیاس تھی..

جانی اور اللہ بخش کے ہاتھ ابھی تک بندھے ہوئے تھے..

اُن میں مرتضیٰ بیگ کچھ بہتر حالت میں تھا اور اُسی نے تہہ خانے کی تاریکی کو ٹٹول ٹٹول کر اندازہ لگایا کہ وہاں اور بھی ہیں.. اور کون ہیں!



تو وہ باتیں کرتے رہے..

اُن کے لب ہلتے جاتے تھے.. وہ اپنے تئیں بولتے جاتے تھے لیکن تہہ خانے میں سناٹا تھا..

اُن کے اوپر جو چھت تھی اُس پر قلعہ جنگی کا کچا صحن مگر چاندنی میں پھیلا ہوا ایک گرد آمیز کائنات کی مانند جس کا کوئی انت نہ تھا جس کے سارے سیّارے اور ستارے سکوت میں جا چکے تھے.. ٹوٹ پھوٹ کر بکھر چکے تھے، مردہ ہو چکے تھے.. نہ گھومتے تھے نہ گردش کرتے تھے بس مٹی میں اُلٹے منہ کھولے پڑے تھے اور صرف وہ سات تھے جو اس کائنات کے ایک بلیک ہول میں پوشیدہ تھے..

بلیک ہول میں پناہ لینے والے یہ جانتے ہیں کہ اُن کے سانس عارضی ہیں اور وہ کسی بھی لمحے اُس کی سیاہ ہولناکی کے اندر نگلے جائیں گے اور فنا ہو جائیں گے.. اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر وہ اگلی سویر ہاتھ بلند کر کے تہہ خانے سے باہر آ جائیں اور سروں سے پگڑیاں اتار کر.. بے شک وہ صرف ابوطالب کی ایک پگڑی ہو.. اُسے گلے میں ڈال کر باہر آ جائیں تو کچھ امکان اگرچہ موہوم اس بات کا تھا کہ وہ بخشے جائیں.. جان کی امان پا جائیں..

اُن کے مقامی ساتھیوں نے ایسا ہی کیا تھا..

لیکن اُن کا.. جو پگڑیاں گلے میں ڈال کر ہار مان گئے تھے اور اُن کا جو غیر ملکیوں کی آسمانی مدد کے سہارے جیت گئے تھے.. وطن ایک ہی تھا.. قبیلے جدا تھے لیکن صدیوں کی آویزش کے باوجود زمین ایک ہی تھی.. اُنہیں بہر طور اکٹھے رہنا تھا.. ہار جیت کا یہ کھیل آخری تو نہ تھا اس لیے کھیل میں جیتا ہوا کھلاڑی یہ ذہن میں رکھتا تھا کہ آئندہ کبھی وہ بھی گلے میں پگڑی ڈال کر اُن کے سامنے ہاتھ بلند کر سکتا ہے اس لیے وہ ایک دوسرے کا لحاظ کرتے تھے..

البتہ اُن کے لیے.. جو اس تہہ خانے میں مدفون تھے.. جو اپنا اپنا ایک

وطن رکھتے ہوئے بھی بے وطن ہوئے تھے اُن کے لیے کوئی لحاظ نہ تھا.. کوئی پناہ نہ تھی..

اگر آج شمالی غیر ملکیوں کی آسمانی مدد سے جیت کی حالت میں تھے تو طالبان نے بھی تو غیر ملکیوں کی زمینی مدد سے اُن کو زیر کیا تھا..

مدد.. آسمانی ہو یا زمینی بہر طور غیر ملکی ہوتی ہے.. اگر آج وہ جو پسپا ہو رہے تھے اور آسمانی مدد کو کوستے اُس کی جان کے ویری ہوتے تھے تو جو کل تھا اور اُس کل میں اُن کے مخالفوں کی حمائت میں آنے والے جو غیر ملکی تھے شمالی اُن کی جان کے ویری ہوتے تھے تو اس ویر کا ایک قابل فہم جواز موجود تھا.. وطن رکھتے ہوئے بھی بے وطن ہو جانے پر نصیب میں یہی کچھ لکھا جاتا ہے جو ایک بے وطن کے نصیب میں لکھا گیا..

انہوں نے ایک بے وطن کو دیکھا تھا جب وہ ناچ رہا تھا..

اُس کا بدن مزار شریف کی ایک گلی میں والہانہ ناچ رہا تھا..

اور قونیہ کے مست الست درویش.. شاہ حسین کے ملنگ یا شہباز قلندر کے قلندر بھی کیا ناچتے ہوں گے.. جو وہ ناچ رہا تھا..

اُس نے کہیں سے بھی.. کسی درگاہ یا رقص کی اکیڈمی سے ناچ کی تربیت حاصل نہیں کی تھی.. اس لیے وہ کوئی ایک خاص کلاسیکی یا پاپ رقص نہیں کر رہا تھا.. کتھک یا راک اینڈ رول یا خٹک بھی ناچ نہیں رہا تھا.. یہ رقص اُس کی پہلی اور آخری اختراع تھی.. اُس کے بدن کی پھڑک یا تڑپ کو کسی بھی رقص کی کیٹگری میں فِٹ کرنا ذرا مشکل تھا..

رقص میں ایسی حیران کن انفرادیت کبھی دیکھنے میں نہ آئی تھی..

وہ ابھی تازہ تازہ مردہ ہوا تھا..

ایک بے وطن طالبان ابھی ابھی مزار شریف کی ایک گلی میں تازہ تازہ کیفر



کردار کو پہنچا تھا..

وہ کسی.. شریعت یا شہادت.. یا جہادی ملّا کے فلسفے سے متاثر ہو کر صدق دل سے.. اگرچہ کچی عمر کی ناپختہ فہم کے صدق دل سے.. ادھر آ نکلا تھا.. اُسے کچھ پتہ نہ تھا کہ اُس کے مدمقابل جو کافر ہوں گے وہ شائد اُس سے کہیں بڑھ کر پرہیز گار.. شریعت کے پابند اور باریش ہوں گے اور وہ بھی شہادت کے طالب ہوں گے اور وہ کسی مولانا سینڈوچ کا بہکایا ہوا صدق دل کی بے دھیانی میں ادھر آ نکلا تھا اور اُسے یہ بھی گمان نہ تھا کہ راہ حق میں شہید ہونے کے بعد بھی وہ ایک منفرد رقاص ہو جائے گا..

رقص و سرود اور موسیقی سے متنفر ہونے کے باوجود موت کے بعد رقاص ہو جائے گا.. اُس کے تازہ تازہ مردہ بدن میں سرنجیں داخل کر کے انہوں نے اُس کا ابھی تک گرم خون جتنا بھی ممکن ہو سکتا تھا نکال لیا.. اور پھر انہی سرنجوں کو خالی کر کے اُن میں پٹرول بھر کر اُس کی شریانوں اور نظام بدن میں یہ پٹرول انجیکٹ کرنے کے بعد اُسے ایک دیا سلائی کا بھڑکتا ہوا شعلہ دکھا دیا گیا..

ایک انسانی بدن میں اگر خون کی بجائے پٹرول بھرا ہو.. بے شک گردش میں نہ ہو تو اُسے آگ دکھا دی جائے تو پھر وہ بدن کیسے اُچھلتا ٹاپتا تڑپتا رقص کرتا ہے..

یہ اُنہوں نے مزار شریف کی ایک گلی میں دیکھا تھا.. لوگ تالیاں بجاتے تھے لیکن پٹرول میں جھلستے بھڑکتے بدن کے رقص کے ساتھ تال میں تال نہیں ملا پاتے تھے کہ یہ کوئی باقاعدہ.. سُر تال میں گندھا ناچ تو نہ تھا..

غیر ملکی زمینی مدد کی کوئی سُر تال نہیں ہوتی..

بے وطن رقاص یونہی بے سُرے پھڑکتے اور ناچتے ہیں.. مردہ ہو جانے کے باوجود بھی.. چنانچہ اُن کے لیے.. جو اس تہہ خانے کی عارضی عافیت میں پنہاں

تھے یہی بہت تھا کہ وہ مزار شریف کی کسی گلی میں رقص کناں نہیں ہیں..

اُن کے ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے.. وہ باتیں کر رہے تھے لیکن کوئی آواز نہ تھی.. تہہ خانے میں سیاہی کا سناٹا تھا..

مگر چاندنی قلعہ جنگی کے صحن میں مدھم ہوتی تھی..

اور اُس کے نیچے اُن کے ہونٹ ہل رہے تھے.. وہ نیم مردہ حالت میں پڑے باتیں کیے جا رہے تھے اور کسی نے بھی یہ محسوس نہ کیا کہ جانی خاموش ہو چکا ہے..

صرف گھوڑا تھا جو منتظر تھا..

اور وہ جانتا تھا کہ جو اُس کی پشت کو پیار سے سہلانا جانتا ہے بس وہی اُسے اس اذیت سے نجات دلا سکتا ہے.. جو زخمی ہونے میں اور اندھیرے میں ہونے سے تھی.. سناٹے اور اندھیرے میں جب کہ تہہ خانے میں اُترنے والی پہلی سیڑھی سے بھی مگر چاندنی سمٹنے والی تھی.. ایک شعلہ بھڑکا اور ایک بھاری وجود کے گرنے کی آواز نے سناٹے کو پاش پاش کر دیا..

"مجھے اب بھی گھوڑوں سے پیار ہے.." جانی نے لبلبی سے پیوست اُنگلی بمشکل الگ کی..

گھوڑا.. رہوڈز کے مجسمے کی مانند یکدم گرا.. اُس کی تقدیس مرگ کا شکار ہوئی اور وہ خوراک ہو گیا..



سینتیسویں سیڑھی کے آس پاس جہاں پچھلی شب مگر چاندنی تھی اب وہاں تیز دھوپ تھی..

دھوپ وہیں ٹھہری ہوئی تھی لیکن اُس کی کچھ سفیدی سیڑھیاں اُترتی تہہ خانے کے اندر سرائت کرتی اُس کے اندھیارے میں اپنا آپ گھولتی.. اُس میں نقب لگاتی اُن سب کی کچھ نہ کچھ شناخت کرتی تھی..

وہ سب ادھ موئے پڑے تھے اور گھوڑا پورا مویا پڑا تھا..

وہ ساتوں یہیں پیدا ہوئے تھے.. ہزاروں برسوں سے اسی تہہ خانے میں تھے..

لیکن ہزاروں برس پہلے کوئی ایک ساعت ایسی بھی گزری تھی جب وہ ایک دوسرے کے لیے یکسر اجنبی تھے.. اُن کے چند ہتھیار' سیاہ پگڑیاں اور جنون بظاہر ایک جیسے تھے لیکن وہ ایک دوسرے سے رنگ و نسل' ثقافت اور خصلت میں مختلف تھے.. وقت کی وہ ساعت جب وہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے قندوز کے محاصرے کے دوران اُن پر محیط ہوئی تھی.. وہ امریکیوں سے لڑنے آئے تھے لیکن وہاں اُن کے مدمقابل اُنہی کے عقیدے کے باریش لوگ تھے.. امریکی اوپر ہی اوپر کہیں آسمانوں میں تھے اور اپنے بوجھ گرا کر چلے جاتے تھے.. یہ بوجھ پندرہ ہزار پاؤنڈ وزنی ڈیزی کٹر ہوتے تھے جو عرف عام میں منی ایٹم بھی کہلاتے تھے اور

اس بوجھ کی بھڑک اور پھٹنے سے پورے پورے پہاڑی سلسلے میدانوں میں بدل جاتے تھے اور ان کے دامن میں آباد گاؤں اور بستیاں لمحوں میں دفن ہو جاتے تھے۔ کلسٹر بم اور بنکر بسٹر بھی وہ بوجھ تھے جو اُن پر گرتے تھے۔

اُن میں سے کئی جو سرحد پار سے آئے تھے اور صرف تلواروں سے مسلح تھے اور انہیں اس جذبے سے سرشار کیا گیا تھا کہ اگر ایمان مضبوط ہو تو کفر کو تلوار سے بھی زیر کیا جاسکتا ہے.. لیکن کفر تھا کہ آسمانوں پر ہی اُڑان کر کے چلا جاتا تھا، نیچے آتا تو وہ اُس پر وار کر کے اپنے ایمان کی پختگی کا مظاہرہ کرتے.. مومن تو بے تیغ بھی لڑ سکتا تھا اُن کے پاس تو پھر کچھ زنگ آلود تلواریں تھیں..

امریکی جنگی طیارے دھوپ کی راہ میں حائل ہو کر مسلسل اُن پر سایہ کرتے تھے..

اُن کی خندقوں میں اور اردگرد لاشوں کے انبار تھے جن میں وہ بمشکل بیٹھتے تھے کہ ہر لمحے کوئی رفیق بے نور آنکھوں سے اُنہیں گھورتا تھا کہ میری تعظیم کرو اپنے بوٹ میرے چہرے پر نہ رکھو.. اگر وہ پاکستانی ہوتا تو اُس کے چیتا جوگرز سے اُس کی شناخت کر لیتے چاہے اُس کی صرف ایک ٹانگ ہی کہیں دبی پڑی ہوتی...



مرتضیٰ بیگ بھی چوری چھپے ادھر آیا تھا..

ایک شدید ردِّ عمل نے اُسے سرحد کے اِس پار دھکیل دیا تھا..

دوسروں کی نسبت اُس کی وجوہات کچھ مختلف تھیں.. ذاتی تھیں..

اُس کے والد ارتضیٰ بیگ بھی چوری چھپے ادھر آتے رہتے تھے.. جب ادھر روس کا راج تھا.. وہ سی آئی اے کی اُس ٹیم سے منسلک تھے جو کراچی پورٹ پر لنگر انداز جہازوں سے اُترنے والے اسلحے کی نگرانی کرتی تھی... کلاشنکوفوں' راکٹ لانچروں' لینڈ مائنز وغیرہ کو کنٹینرز میں لاد کر... پاراچنار کے راستے ننگرہار اور پنجشیر تک پہنچاتی تھی.. جہاں مجاہدین کے مختلف گروپ جن میں احمد شاہ مسعود سرفہرست تھا اسے وصول کر کے "بدی کی سلطنت" سوویٹ یونین کے خلاف جہاد میں حصہ لینے والوں تک پہنچا دیتے تھے... اس سارے نیٹ ورک میں فوج مکمل طور پر متحرک تھی اگرچہ سرکاری طور پر بار بار متشرّع صدر صاحب اعلان کرتے تھے کہ ہم افغان جہاد کو صرف اخلاقی سطح پر سپورٹ کر رہے ہیں.. فوج کی انٹیلی جنس کا مکمل رُخ افغانستان کی جانب تھا.. اور یہیں سے اس سلوگن نے جنم لیا کہ افغانی دراصل پاکستان کی جنگ لڑ رہے ہیں اس لیے اُن کی مدد کرنا ہمارا قومی اور ظاہر ہے مذہبی فریضہ ہے.. آئی ایس آئی کے افسر پاکستان سے زیادہ افغانستان کے مختلف حصوں میں پائے جاتے تھے.. کراچی میں اُترنے والے اسلحے کے لیے

بھی این ایل آئی کی فوجی گاڑیاں اور کنٹینرز استعمال کیے جاتے..

اسلحے سے بھرے ہوئے یہ کنٹینرز کراچی سے ننگرہار تک انٹیلی جنس کے کرنل ارتضٰی بیگ کی ذاتی نگرانی میں سفر کرتے تھے اور اِس طویل سفر کے دوران بار بار رُکتے اور متعدد بار کھلتے تھے.. اُن کے آہنی شٹر اُٹھتے اور اُن میں سے جنرل صاحبان کا حصہ نکال کر آرمی کی جیپوں پر لاد دیا جاتا... یہ ایک نارمل پریکٹس تھی..

چنانچہ مجاہدین کے کمانڈرز تک پہنچتے پہنچتے یہ کنٹینرز خاصے ہلکے ہو چکے ہوتے.. یہ تو ممکن نہ تھا کرنل صاحب جہاد کے ثمرات کے لیے قیامت تک انتظار کرتے اور اس بہتی گنگا میں ہاتھ نہ دھوتے.. وہ صرف ہاتھ دھونے پر ہی اکتفانہ کرتے بلکہ اس میں مکمل اشنان کر کے نروان کی حدوں کو چھونے لگتے.. اپنی مدد آپ کے اصول پر عمل کرتے ہوئے گجرات اور جہلم کے درمیان کہیں یہ کنٹینرز رُکتے اور اس بہتی گنگا میں سے بہت کچھ نکال کر اپنے منتظر رفقاء کے حوالے کر دیتے جو اُنہیں گدھوں پر لاد کر لے جاتے.. بعد میں صرف اسی اسلحہ کی فروخت سے وہ الیکشن کے اخراجات برداشت کرنے کے قابل ہوتے.. کرنل ارتضٰی بیگ نے ملکی سیاست میں ایک نمایاں مقام پایا اور افغان جہاد کے ہیروز میں اُن کا شمار کیا گیا..

اور ہاں یہ ٹریفک یک طرفہ نہ تھی..

افغان سرحد سے واپسی پر یہ کنٹینرز مکمل طور پر خالی نہ لوٹتے.. ان میں سفید سفوف کی کچھ پوٹلیاں ہوتیں جو ایک مرتبہ پھر جہلم اور گجرات کے درمیان اُن کے رفقاء کے حوالے کر دی جاتیں.. صرف ایک فرق کے ساتھ کہ پہلے وصولی کے لیے متعدد گدھے موجود ہوتے لیکن اب باربرداری کے لیے صرف دو گدھے ہی کافی ہوتے..

افغانستان میں ''ایول ایمپائر'' کے خاتمے کے لیے ایک مقدس جنگ میں حصہ لینے والے مجاہدین کے لیے اسلحہ صرف کنٹینرز میں ہی نہیں ٹرینوں میں



بھی آتا تھا.. رائفلیں، مشین گنیں، راکٹ لانچر، مارٹر شیل سب کے سب چینی ساخت کے ہوتے تھے لیکن یہ چین کی جانب سے اُس کے حریف سوویٹ یونین سے برسرپیکار مجاہدین کے لیے ایک تحفہ یا صرف خیر سگالی کے جذبات کا اظہار نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کی ڈالروں میں ادائیگی انکل سام اپنے پلّے سے کرتا تھا..

چینی نہ صرف روسیوں کی ہزیمت کا باعث بھی بن رہے تھے بلکہ پکّے کاروباریوں کی مانند بے مثال منافع بھی کما رہے تھے..

کراچی سے آنے والی یہ سپیشل ٹرینیں عام طور پر چکلالہ کے سٹیشن پر رُکتیں اور وہاں سے یہ اسلحہ اوجڑی کیمپ اور سیکٹر F/7 کے ''سیف ہاؤسز'' میں منتقل کر دیا جاتا.. اسلام آباد کے آب پارہ چوک سے ذرا ادھر زیرو پوائنٹ سے ذرا آگے آئی ایس آئی کا "The Main" تھا.. جہاں افغان جنگ کا ایک اور ہیرو جنرل اختر عبدالرحمٰن انچارج تھا.. شنید ہے کہ یہاں جس بھی فوجی افسر کی تعیناتی بطور کرنل ایڈمن ہوتی.. اکاؤنٹس اور کیش کا شعبہ جس کی نگرانی میں ہوتا اُس پر قدرت اتنی مہربان ہوتی کہ وہ چند دنوں میں قارون کا ہم پلہ ہو جاتا بلکہ اُس سے بھی کہیں آگے چلا جاتا.. قارون نے بہر طور وہ دولت لوٹی یا کمائی یا مشکل سے حاصل کی تھی لیکن کرنل ایڈمن اپنی نشست پر بیٹھے بیٹھے یہ سب کچھ حاصل کر لیتا..

امریکہ کی جانب سے مجاہدین کے آٹھ گروپوں کو آشیرواد حاصل تھی..

ان گروپوں کو جہاں اسلحے کی لامحدود سپلائی دی جاتی وہاں ان کے لیڈروں کے ذاتی اخراجات کے لیے ہر ماہ آٹھ لاکھ روپے کی رقم ادا کی جاتی.. اُن میں سیاف اور ربانی بھی شامل تھے اور حکمت یار بھی.. ان میں افغان جہاد میں حصہ لینے والا ایک ایسا لیڈر بھی تھا جس کا مستقل قیام اسلام آباد کے سب سے پاش ایریا میں تھا اور اُس مجاہد کی بیٹیاں ہمیشہ امریکی نیلی جینز میں ملبوس ہوتیں اور اُن کے

جہاد کا ایک اپنا ہی کانسپٹ تھا جو اسلام آباد کی کلبوں ' ریستورانوں اور پرائیویٹ پارٹیوں میں اپنے رنگ اور انگ دکھاتا..

یہ لیڈر عام طور پر آئی ایس آئی کے "The Main" میں ہر ماہ حاضری دیتے..

"The Main" کا ایک وسیع تہہ خانہ تھا جسے سٹرانگ روم کہا جاتا تھا..

اس تہہ خانے میں ادائیگی کی رقم صندوقوں یا آہنی تجوریوں میں نہیں رکھی جاتی تھی بلکہ اس کی وسعت میں فرش پر ڈھیروں کی صورت.. اگرچہ ایک خاص ترتیب اور نفاست سے پڑی ہوتی تھی.. لاکھوں اور کروڑوں کے حساب سے.. بلکہ بے حساب کیونکہ اس کی گنتی کبھی نہیں ہوتی تھی..

رقم ہمیشہ حسب خواہش کرنسی میں میسر ہوتی..

سٹرانگ رُوم کے تہہ خانے کا نصف حصّہ ڈالروں سے ڈھکا ہوا تھا..

ڈالروں کے بعد سعودی ریالوں کی اجارہ داری تھی..

پاکستانی روپوں کی بھی افراط تھی اور افغانی بھی تھے جو صرف اس لیے حاصل کیے جاتے کہ اُن سے افغانستان میں برسرِ پیکار مجاہدین کی حوصلہ افزائی کی جاسکے.. وہ مجاہدین بھی وسعت علم میں طالبان سے کم نہ تھے اور ڈالر اور ریال پر یقین نہ رکھتے تھے.. اُنہیں صرف افغانی نوٹوں کی پہچان تھی..

یہ ایس ایس فنڈ تھا..

اس کا کوئی آڈٹ نہ تھا..

کوئی اندراج نہ ہوتا تھا کہ یہ کتنا آیا اور کتنا گیا اسی لیے کرنل ایڈمن دنوں میں قارون ہو جاتا تھا اور آل انچارج جنرل صاحب تو پتہ نہیں کیا ہو جاتے تھے.. اور ہو گئے..

اُن دنوں آٹھ لاکھ روپے ماہانہ بہت بڑی رقم ہوتی تھی.. آج کے ایک



کروڑ سے بھی کہیں زیادہ اور اُسے کسی سوٹ کیس یا بیگ میں بند کر کے نہیں لے جایا جا سکتا تھا کہ ان دنوں ابھی پانچ سو اور ایک ہزار کے نوٹ رائج نہیں ہوئے تھے اس لیے نوٹوں کے یہ پلندے لیڈروں کی بڑی بڑی گاڑیوں کی ڈکیوں میں سٹیک کیے جاتے اور اکثر اوقات جب ڈکی میں مزید گنجائش نہ رہتی تو ڈالروں کے پلندے مجبوراً پچھلی نشستوں پر ڈھیر کر دیئے جاتے..

بعض اوقات ان پلندوں کو کسی لیڈر کی گاڑی کی ڈکی میں رکھنے والے کسی معمولی فوجی کی قسمت بھی بدل جاتی.. اُسے بھی افغان جہاد کے ثمرات میں سے کوئی ایک پھل ڈالروں کی ایک گٹھی کی صورت میں مل جاتا..

اس تمامتر آرگنائزیشن کے باوجود افغان جہاد صراط مستقیم پر نہیں جارہا تھا..

اسے اُس سیدھے اور پوتر راستے سے ہٹانے والے روسیوں کے ہیلی کاپٹر گن شپ تھے جو افغانستان کے دیہات اور مجاہدین کو برباد کرتے چلے جاتے تھے..

وہ بمبار طیارے تھے جو بے دریغ ہر شے کو تباہ کرتے جاتے تھے..

ان ہیلی کاپٹر گن شپ اور طیاروں کی آسمانوں پر مسلسل موجودگی امریکیوں اور مجاہدین کے لیے اُس جگہ پر درد تھی جس کا نام نہیں لیا جاسکتا..

انہیں آسمانوں سے ہٹانے کے لیے ایس-اے-سیون میزائل استعمال ہوتے تھے جو مکمل طور پر مؤثر نہ تھے.. اُن کی ہٹ ریشو تیس فیصد سے بھی کم تھی.. اور روسی اس نقصان کو فوری طور پر پورا کر کے آسمانوں پر اپنی برتری قائم رکھنے میں کامیاب رہتے تھے.. امریکہ نے بہت دیر صبر کیا لیکن جب "ایول ایمپائر" قوت ایمانی اور ڈالروں کے سامنے ڈٹی رہی تو پھر مجبوراً ایک ایسے ہتھیار کو اسلحہ خانے سے نکالنا پڑا جسے امریکیوں نے صرف تیسری جنگ عظیم کے لیے سنبھال رکھا تھا اور خفیہ رکھا تھا..

یہ سٹنگر میزائل تھے..

اُن زمانوں میں صرف ایک میزائل کی تیاری پر ایک لاکھ ڈالر کا خرچہ اُٹھتا تھا.. جب سٹنگرز ایک مجبوری ہوگئے تو چکلالہ ایئرپورٹ پر سی وَن تھرٹی اُترنے لگے.. سعودی ایئرلائن کی فلائٹس پر وہ اسلام آباد ایئرپورٹ پر اُترنے لگے..

ان میزائلوں نے جنگ کا نقشہ بدل کر رکھ دیا..

ایس-اے-سیون جہاں تیس فیصد ہٹ کی اہلیت رکھتے تھے وہاں سٹنگر جب ایک بار فائر کردی جاتی تھی تو وہ ہیلی کاپٹر گن شپ یا کسی بمبار طیارے کو تباہ کیے بغیر نہ رہتی تھی..

سٹنگر کی ہٹ اہلیت سو فیصد تھی..

ہیلی کاپٹر گن شپ اور روسی طیارے مکھیوں کی طرح مارے جانے لگے اور بالآخر روسی ریچھ نے اُنہیں گراؤنڈ کردیا..

جب فضاؤں میں گن شپ اور طیّارے نہ رہے تو افغانستان میں ایک عظیم فتح کا میدان صاف ہوگیا..

مرتضٰی بیگ کے مجاہد باپ کے ہاتھوں میں بھی کچھ سٹنگرز آئے جن میں سے کچھ آگے گئے اور کچھ پیچھے اُس کے پاس رہ گئے..

کسی ایک سٹنگر کو بیچنے سے دو تین فیکٹریاں خریدی جاسکتی تھیں..

کرنل ارتضٰی بیگ ریٹائرمنٹ کے بعد نہ صرف ملکی سیاست میں معزز ٹھہرے بلکہ اُنہوں نے اس عظیم جہاد کے ثمرات کو ایک انڈسٹریل ایمپائر میں بدل دیا اور ایک آسائشی زندگی کی لطف اندوزی میں شب و روز بسر کرنے لگے..

مرتضٰی اُن کا کراؤن پرنس تھا..

اور ایک کراؤن پرنس جس شان و شوکت کا حقدار ہوتا ہے.. وہ نہ صرف اُسے



بلکہ اُس کے قریبی دوستوں کو بھی وافر تعداد میں ملی.. یاد رہے کہ یہ وہ شان و شوکت نہیں جو کسی برطانوی یا یورپی کراؤن پرنس کے نصیب میں ہوتی ہے بلکہ وہ تو اس کے خواب بھی نہیں دیکھ سکتے کہ وزارت خزانہ ہر وقت اُنہی کے حساب کتاب پر نظر رکھتی ہے اور اگر وہ اپنے وظیفے کی رقم سے ذرا تجاوز کریں تو اُن کی جواب طلبی ہوجاتی ہے اور ملکی اخبار شور مچادیتے ہیں.. ایک پاکستانی کراؤن پرنس جو ایک مجاہد کا بیٹا ہوتا ہے ان پابندیوں سے ماورا ہوتا ہے اور اُس سے کوئی سوال نہیں پوچھے جاتے..

مرتضٰی بیگ اپنے نامور والد کے افغانی جہاد کے کارناموں کے بارے میں لکھی گئی کتابوں کو پڑھتے پڑھتے جوان ہوا.. ان کتابوں کی اشاعت پر خاصی رقم صرف ہوتی تھی اور اُنہیں ملک کی اہم ہستیوں اور چیدہ کالم نگاروں کو تحفے کے طور پر بھیجا جاتا تھا...

ارتضٰی بیگ اپنے کراؤن پرنس کے سر پر وہی تاج رکھنا چاہتے تھے جس میں سٹنگرز' کلاشنکوفوں' راکٹوں اور سفید سفوف کے کوہ نور جڑے ہوئے تھے اور وہ اس تاج کی حمائت اور سچائی میں اُسے اکثر اپنے سامنے بٹھا کر مدلل لیکچر دیا کرتے تھے جس میں وہ ثابت کردیتے تھے سوویٹ یونین کے بکھرنے میں اُس کے پاش پاش ہوجانے میں اُن کی بے لوث قوت ایمانی اور مجاہدانہ کاوشوں کا بڑا ہاتھ تھا..

یہ لیکچر وہ ہمیشہ تب دیتے تھے جب وہ گئی رات اپنے "سیف ہاؤس" سے لوٹتے تھے.. "سیف ہاؤس" شہر کی ایک تہذیب یافتہ اور گھنی آبادی کے درمیان میں پوشیدہ ایک ایسا گھر تھا جس کی ظاہری صورت سے یہ نہیں لگتا تھا کہ یہاں کوئی رہتا ہے... دن کے وقت وہ بے آباد لگتا تھا..

وہ گئی رات تب آباد ہوتا جب اُس کے وسیع پورچ میں مہنگی اور دھندلاتے

ہوئے شیشوں والی گاڑیوں کی قطار لگ جاتی...

"سیف ہاؤس" ایک دارالامان تھا.. کہ جو بھی اس میں داخل ہوتا وہ امان میں آجاتا.. وہ امان سے بے فکر اور لاپرواہ ہو کر ارتضٰی بیگ کی یونیک مہمان نوازی کے سایۂ عاطفت میں آکر زندگی کی کلفتوں کو کڑوے پانیوں میں ڈبو دیتا.. خود بھی ڈوبتا.. ڈوبنے کے بعد اُبھرتا تو.. اپنے سامنے دنیا کی حسین ترین ناف کو سکڑتے لچکتے دیکھتا اور اگرچہ اُس کے اوپر راحت کی بھاری وادیاں بہار پر ہوتیں لیکن وہ اُس ناف تلے جو لطف کے سازوسامان تھے اُنہیں دیکھتا.. اُس پر ڈالر یا روپے جو کچھ بھی حسب استطاعت ہوتا لٹاتا اور پھر کسی ایک ناف کو ترجیح دے کر اُس کے ہمراہ "سیف ہاؤس" کے متعدد بیڈرومز میں سے کسی ایک میں جالیٹتا..

سائیڈ ٹیبل پر رائل سیلوٹ کی بوتل اور گلاسوں کے زیرسایہ ویاگرا یا رِیل کی گولیاں منتظر ہوتیں.. کہ ان میں سے بیشتر ڈھلتی عمر کے لوگ تھے اور جو کچھ تھا وہ بھی ڈھل چکا تھا اسے آمادۂ عمل کرنے کے لیے کبھی یہ گولیاں کارآمد ہو جاتیں اور کبھی نہ بھی ہوتیں..

ارتضٰی بیگ اسی "سیف ہاؤس" سے واپسی پر کراؤن پرنس کو اپنے سامنے بٹھا کر لیکچر دیا کرتے تھے..

کراؤن پرنس بھی اکثر اسی حالت میں ہوتا جس حالت میں قبلہ والد صاحب ہوتے.. شہر کے تمام ریستوران' پرائیویٹ شکار گاہیں اور گھرانے اور فارم ہاؤس اس کی زد میں تھے کیونکہ ایک تو وہ ایک نامور مجاہد اور صنعت کار کا بیٹا تھا اور دوسرے وہ ہر دو چار ہفتوں کے بعد ایک نئی سنی پٹرول میں سے اترتا... اگرچہ لنڈن اور پیرس میں بھی کچھ معمولی سی رہائش گاہیں تھیں اور وہ وہاں آتا جاتا رہتا لیکن زندگی کا جو بے حساب اور بے انصاف لطف یہاں تھا وہاں نہ تھا... ان غیر ملکی رہائش گاہوں میں کل وقتی ملازم رکھنا وہ افورڈ نہیں کر سکتے تھے اور ناشتہ خود بنانا پڑتا تھا..



لیکن اس بے مہار بے فکر حیات میں کوئی ایک ساعت آئی..

اس ساعت کے یکدم آجانے کا کوئی جواز نہ تھا..

یہ ساعت شاید انسانی دماغ کے لاتعداد غیر متحرک خلیوں میں سے کسی ایک کے بے جواز متحرک ہو جانے سے وجود میں آجاتی ہے..

اس کی کوئی توجیہہ بیان نہیں کی جا سکتی..

کوئی ایک ساعت ایسی آگئی جب مرتضٰی بیگ نے اپنے کراؤن کو بوجھل محسوس کیا.. زندگی میں پہلی بار اس میں سے سٹنگرز' کلاشنکوفوں اور سفید سفوف کی... اور "سیف ہاؤس" سے لوٹتے والد صاحب کے منہ سے شراب اور ان کے وجود میں رچی جنس کی نمی کی ناقابل برداشت بُو آنے لگی.. اور وہ باغی ہو گیا..

ویسے بغاوت کبھی بے جواز نہیں ہوتی..

جیسے دہشت گردی بھی کبھی بے جواز نہیں ہوتی..

ہاں ایک عام سا ماجرا ہوا..

وہ شہر کے سب سے اِن کاریگر اور قدیمی ہیئر ڈریسر کے سیلون میں آویزاں متعدد قدِ آدم شیشوں میں اپنے آپ کو دیکھ رہا تھا اور دھیان رکھ رہا تھا کہ وہ کہیں اس کے سر کے اس حصے پر قینچی کے وار زیادہ نہ کر دے جہاں اس کے بال چھدرے ہو رہے تھے اور اس نے سرسری طور پر پوچھا "گلو.. تم پچھلے دو ماہ سے کہاں تھے.. تمہارے کاریگروں کو بھی کچھ پتہ نہ تھا کہ تم کہاں چلے گئے ہو.. کہاں تھے؟"

"بس بیگ صاحب.. میں بس ادھر ہی تھا.."

"اوئے یہاں آنے والی کسی خاتون کے ساتھ تو کہیں نہیں نکل گئے تھے؟"

"نہیں جی.." گلو خان کے سپید چہرے پر شرماہٹ آگئی "آپ جانتے ہیں کہ مجھے یہ شوق نہیں.."

"تو پھر کہاں تھے؟" مرتضیٰ کو بھی کرید نے میں مزا آنے لگا..

"آپ بتائیے گا نہیں کسی کو.."

"نہیں.. کہاں تھے.."

"میری زندگی نے ایک کروٹ لی ہے بیگ صاحب.." وہ برابر میں بال کاٹتے کاریگر کی جانب ایک نظر دیکھ کر سرگوشی میں بولا "میں قبائلی علاقے میں گیا تھا جہاد کی ٹریننگ لینے.."

"کیا؟" مرتضیٰ بیگ اتنا ششدر رہا کہ گلو کی قینچی نے اس کی گردن کے پچھلے حصّے میں ایک ہلکا سا زخم لگا دیا..

گلو خان ایک پڑھا لکھا.. مغربی موسیقی کا شدید شوقین.. صرف نفیس لباس اور ہیئر ڈریسنگ میں دلچسپی لینے والا نوجوان.. جسے مذہب سے عید بقر عید اور جمعہ کی نماز کے سوا کوئی لگاؤ نہ تھا..

"لیکن کیوں گلو؟"

"آخرت کی بھی تو کوئی فکر کرنی چاہیے مرتضیٰ صاحب.. یہ سب کاروبار اور بال بچّے کسی کام نہیں آئیں گے.. عمل ہی کام آئیں گے.. جہاد کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے.."

"لیکن گلو ہمارے ملک میں تو کوئی جہاد نہیں ہو رہا.. ہیں؟"

"دنیا کے دوسرے خطّوں میں تو ہو رہا ہے ناں سر.. کشمیر میں.. چیچنیا میں.. افغانستان میں.. تو مومن کا فرض ہے کہ ان کے ساتھ شامل ہو کر طاغوتی قوتوں کو شکست دے اور اسلام کا بول بالا کرے.."

"اور پاکستان.."

"پاکستان کا تو اللہ تعالیٰ محافظ ہے.. یہاں بھی جہاد ہوگا انشاء اللہ.. آپ کسی سے ذکر نہ کیجیے گا لیکن آیندہ چند ہفتوں میں.. اپنا کاروبار وائنڈ اپ کر کے میں



بھی جہاد کے لیے جا رہا ہوں.. جنّت بٹ رہی ہے سر.."

گلو خان عجیب و غریب زبان بول رہا تھا... وہ ہمیشہ تازہ ترین انڈین گانوں.. کرکٹ میچوں. فلمی سکینڈلز اور فیشن شوز کے بارے میں اپنی قینچی سے بھی زیادہ تیزی سے کومنٹری کرتا تھا. یہ ایک نہ سمجھ میں آنے والی تبدیلی تھی..

اس رات بلیک لیبل کی پونی بوتل اور پرانے پنجابی گانوں کے ری مکس پر نخرے دکھانے والی اداکارہ کا وہ بدن جو ٹیلی ویژن پر بے حد ہیجان خیز لگتا تھا اگرچہ بے لباس خاصا ناتواں لگتا تھا.. راحت نہ دے سکا.. پہلی بار کراؤن پرنس کو اپنے کراؤن میں کانٹوں کا احساس ہوا..

اس نے موبائل پر گلو خان سے رابطہ کیا..

"جی مرتضیٰ بھائی آپ جب کہیں میں بندوبست کر دوں گا.. بلکہ آپ کے ساتھ چلوں گا سر"

صرف ایک نہ سمجھ میں آنے والی صورت حال کو سمجھنے کے لیے.. ایک تجسّس کی خاطر.. ایک نئے نشے کا تجربہ کرنے کے لیے.. اپنے والدین سے یہ کہہ کر کہ وہ چند دوستوں کے ہمراہ بوٹ کلب کراچی میں چند روز گزارنے جا رہا ہے وہ گلو خان کے ہمراہ علاقہ غیر میں ایک جہادی کیمپ میں جا پہنچا..

سب نے اسے شک کی نظروں سے دیکھا کہ وہ صاف ستھرے رخساروں والا داڑھی کے بغیر تھا..

گلو خان ان سب سے بغل گیر ہوتا تھا..

وہاں عجیب سے لوگ تھے..

تنگ نظر اور متعصب.. اگرچہ بے حد نڈر اور بیباک تھے اور ہینڈ گرنیڈ کو تب تک نہ پھینکتے تھے جب تک کہ اس کے پھٹنے کا آخری لمحہ نہ آ جاتا..

ان میں سے بیشتر کم پڑھے لکھے اور دیہاتی تھے جو کیمپ کمانڈر کے وعظ

کے دوران سر جھکائے اپنی نوخیز داڑھیاں سہلاتے رہتے.. ان کی سوچ مکمل طور پر یک طرفہ تھی اور مخالف سمت سے آتی ہوئی کوئی بھی سوچ سوائے کفر کے اور کچھ نہ تھی..

ان کے ساتھ بحث نہیں کی جا سکتی تھی..

وہ سر سے پاؤں تک سرشار تھے..

سوچ سمجھ سے ماورا ہو چکے تھے..

یہ مرتضیٰ بیگ کے شب و روز سے الگ کوئی اور ہی شب و روز تھے..

اگرچہ ان میں تنگ نظری اور تعصب تھا مگر یہ کوئی اور ہی زندگی تھی..

پنجگانہ نماز۔ تسبیح۔ وعظ اور ہتھیاروں کے استعمال کی تربیت..

خوراک بری تھی اور رہائش اس سے بدتر..

لیکن مرتضیٰ یہ سب کچھ سہہ گیا کہ یہ مختلف تھا.. ایک نیا نا آشنا نشہ تھا.. اسے یہ اذیّت جھیلنے میں لطف آنے لگا.. اب وہ دیوار کے اس پار جا کر اپنے آپ کو آزمانا چاہتا تھا.. یہ محض ایک ایڈونچر نہیں تھا بلکہ اس کی رُوح میں کہیں ایک خلش تھی پچھلے جہاد کے ثمرات کے نتیجے میں اُبھرنے والے ارتضیٰ بیگ کی انڈسٹریل ایمپائر اور سیف ہاؤس کی.. اور اسکے لیکچرز کی.. اس خلش نے جہادی کیمپ کی سادہ اور پُرمشقّت زندگی میں سے جنم لیا تھا.. یہ لوگ کم از کم اس کے باپ سے زیادہ کھرے اور سچے تھے..

وہ کفارہ ادا کرنا چاہتا تھا.. اگرچہ یہ کشمکش بھی اسے بے چین رکھتی تھی کہ اگر مدِ مخالف بھی مسلمان ہے تو اس کے سامنے جنگ میں اترنا جہاد ہے؟.. اور اسے یقین دلایا جاتا کہ طالبان اسلام کے بنیادی اصولوں پر عمل پیرا ہو کر ایک سچے اسلامی معاشرے کے لیے کوشاں ہیں اور ان کے جو بھی مخالفین ہیں انہیں نیست و نابود کرنا عین جہاد ہے.. اور اگر وہ مزید بحث کرتا تو اسے شک کی نظروں سے



دیکھا جاتا بلکہ اس پر واضح کر دیا گیا کہ ٹریننگ کے خاتمے پر اسے بہر صورت جہاد کے لیے جانا ہوگا.. یہاں سے واپسی کی کوئی گنجائش نہ تھی..

تو یہ مرتضیٰ بیگ تھا..

قندوز میں مرتضیٰ بیگ تھا.. ایک ایسا شہر جس کے نام سے بھی وہ ناواقف تھا اور وہ ایک کلاشنکوف سنبھالے ایک گہری کھائی میں چھپا کئی روز کی نقاہت اور بھوک سے نڈھال ان دیکھے دشمن پر بے تحاشا فائر کر رہا تھا.. لاشوں کے انبار میں پھنسا ہوا فائر کر رہا تھا..

کیوں؟

ایک ردّعمل کے نتیجے میں.. یا دل میں سے زندگی کی لایعنیت کی جو ہُوک اٹھتی ہے اسے جواز دینے کے لیے... لیکن بہر طور ایک کفارہ ادا کرنے کے لیے.. اور اس کے لیے اسے بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑ رہی تھی قندوز کی اس کھائی میں.. جہادی ٹریننگ کے باوجود وہ اتنی اذیت اور لاچارگی کے لیے تیار نہ تھا.. آسمانی دشمنوں کے لیے تیار نہ تھا..

اس دوران اس کے لب بھنچے رہے.. دانت ٹوٹنے کو آئے اور صرف ایک مرتبہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے گرد آلود چہرے میں سے نمایاں ہوئی جب اس نے اپنے چیتا برانڈ جوگرز پر ایک نظر ڈالی.. یہ واقعی مرتے دم تک ساتھ دے رہے تھے..

شیزان سے الفلاح بلڈنگ تک مال روڈ کے فٹ پاتھ کے کنارے کہیں بھی کار پارک کرنے کے لیے جگہ نہ تھی.. اس نے متعدد پھیرے لگائے اور پھر زیرِ لب "شِٹ" کہہ کر ایک چھوٹی سی سوزوکی کے عین پیچھے اپنی بڑی سی بی ایم ڈبلیو ڈبل پارک کر دی اور اطمینان سے سروس کے شُو سٹور میں داخل ہو گیا..

شوکیس میں جوگرز اور ہائکنگ بوٹس کی ورائٹی نمائش پر تھی اور وہ ہر ایک کو غور سے دیکھتا جانچتا اندر داخل ہوا تھا..

"آپ کو کس قسم کے جوگرز درکار ہیں سر.." سیلزمین نے اس کا پاؤں ناپ کے تختے میں فٹ کرتے ہوئے دریافت کیا..

"جو پہاڑوں کی سختیاں برداشت کر سکیں.."

"اچھا تو آپ شمالی علاقوں میں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں.. نانگا پربت اور کے ٹو کی جانب.."

"میں پہاڑوں کی طرف جا رہا ہوں.. مجھے ایسے جوگرز درکار ہیں جو صحرا اور پہاڑوں میں یکساں کار آمد ہوں"

سیلزمین نے چیتا برانڈ جوگرز کا ایک جوڑا ڈبّے میں سے نکال کر اس کے تسمے پروئے اور اس کے پاؤں کے آگے رکھ دیئے.." جناب ان دنوں یہ بہت پاپولر ہیں.. پاکستانی میڈ ہیں.. بہت مضبوط ہیں.. مرتے دم تک ساتھ دیں گے.."

واقعی وہ مرتے دم تک ساتھ دے رہے تھے..

اس نے پچھلے تین ہفتوں سے اپنے پاؤں ان میں سے نہیں نکالے تھے.. اسے ڈر تھا کہ ان کے اندر اس کے پاؤں کی وہی حالت ہو گی جو اس کے ایک ساتھی کے پاؤں کی تھی.. کیچڑ اور پانی ان کے اندر مسلسل سرائت کرتا رہا تھا... پسینے سے ان کے اندر جو جرابیں تھیں وہ نچڑتی رہتی تھیں اور اس ساتھی نے جب جوگرز کے بعد جرابیں اتارنے کی کوشش کی تو جِلد کا ماس بھی ساتھ ہی اترتا گیا.. پاؤں اتنے گل چکے تھے..

قندوز کی خندقیں لاشوں سے اٹی پڑی تھیں اور مرتضٰی بیگ ان میں پھنسا



ہوا فائر کرتا جا رہا ہے.. کسی ان دیکھے دشمن پر یا ارتضٰی بیگ کی اس رنگین تصویر پر جو اس کے افغانی جہاد کے کارناموں کی کتاب کے سرورق پر تھی..

اس لمحے اسے علم نہ تھا کہ برابر کی خندق میں کوئی چی چی ابو طالب نیم مدہوش پڑا ہے..

اور نہ ہی ابو طالب جانتا تھا کہ جس خندق سے مسلسل فائر جا رہا ہے وہاں کوئی مرتضٰی بیگ بھی ہے..

اللہ بخش، عبدالوہاب، گل شیر ولی، ہاشم میر اور جانی واکر بھی وہیں کہیں تھے اور ایک دوسرے کے وجود سے بے خبر تھے..

اور اب وہ ہزاروں برسوں سے ایک دوسرے کی خبر رکھتے تھے.. یہیں پیدا ہوئے تھے اسی تہہ خانے میں..

یہاں قلعہ جنگی کے ایک تہہ خانے میں..

جب کہ باہر صبح ہو رہی تھی اور.. ایک گھوڑا مرا پڑا تھا..

دھوپ دوسری سیڑھی تک آگئی تھی..

اوپر جہاں سے دھوپ اترتی تھی قلعہ جنگی کے صحن میں بکھری لاشوں میں سے ہلکی ہلکی بھاپ اٹھ رہی تھی..

دھوپ کی تیزی سے وہ سوکھ رہی تھیں اور ان کے گوشت میں جہاں کہیں کچھ نمی باقی تھی وہ بھاپ بن کر اٹھتی تھی..

گیارہ بجے تھے..

دھوپ دوسری سے تیسری سیڑھی پر تب اترتی جب سورج لاشوں کے عین سر پر آجاتا.. اس کے ڈھلنے سے روشنی پھر سے پہلی سیڑھی کی جانب سرکنے لگتی..

چونکہ وہ اب دوسری سیڑھی پر تھی اس لیے گیارہ بجے تھے..

یہ پیمانۂ وقت ابو طالب کا اختراع کردہ تھا..

اس کا گاؤں چیچنیا کی بڑی آبادی والی بستیوں سے طویل فاصلوں پر داغستان کی سرحد کے قریب تھا.. گاؤں کیا ڈھلوان چھتوں والے چند گھر تھے جو ایک تنگ وادی کے دہانے پر ہرے بھرے کھیتوں میں بکھرے ہوئے تھے... سرما کے دو تین ماہ وہ گھروں میں بند رہتے آگ پر جھکے رہتے اور ان کے چہرے دھوئیں سے سیاہ پڑ جاتے... ان کے گھروں کے دروازے مشکل سے ہی کھلتے کہ برف ان



کی کمر تک آجاتی.. زیرزمین تہہ خانوں میں بند مویشیوں کو خشک چارہ ڈالنے اور ان کا دودھ دوہنے کے سوا انہیں اور کوئی کام نہ ہوتا.. اس دوران دودھ.. خشک پنیر اور کبھی کبھار خشک سبزیوں کا شوربہ اور روٹی ان کی خوراک ہوتی.. سردیوں کے دوران ان کے دروازے برف کے بوجھ سے اتنی مضبوطی سے بند رہتے کہ انہیں کنڈی لگانے کی بھی ضرورت پیش نہ آتی اور جب وہی دروازے آپس میں بھڑنے لگتے ان کی چولوں میں سے رات کو آوازیں آنے لگتیں تو وہ جان جاتے کہ موسم سرما رخصت ہونے کو ہے اور باہر برف کا بوجھ کم ہو رہا ہے' پگھل رہا ہے..

ایک کہاوت تھی کہ جب سردیوں میں دروازہ ذرا سا دھکیلنے سے کھل جائے تو اس کے اندر جو مہمان داخل ہوتا ہے وہ موسم بہار ہے..

ابو طالب کی دادی نفیسہ خاتون موسم بہار کا استقبال اپنی حقّی میں پہاڑی تمباکو بھر کر ایک لمبا کش لگا کر کرتیں اور اس کی خوشبو ہر سُو پھیل جاتی یہاں تک کہ وادی کے دوسرے گھروں کے مکین بھی اس کی مہک پا کر اپنے دروازے وا کر دیتے..

اُوپر بلند کہساروں پر برف پگھلتی تو اُن کی تنگ وادی میں جھرنے اُترنے لگتے اور جہاں کہیں کوئی چٹان ہوتی' وہ آبشار میں بدل جاتی.. سنہری چونچ والے عقاب اپنے گھونسلوں سے نکل کر وادی پر پرواز کرنے لگتے..

ابو طالب کو اُس کی دادی نے پالا تھا.. اُس کے ماں باپ کا جھونپڑا اُس بڑے سیلاب کی زد میں آگیا تھا جو مقامی ندی میں ایک عرصہ پہلے پتھروں کو دھکیلتا وادی کو بہا کر لے گیا تھا.. اُسے اُن کی شکل بھی یاد نہ تھی..

ابو طالب نے ابتدائی تعلیم وادی کے دامن میں آباد ایک بڑے گاؤں کی مسجد میں حاصل کی اور پھر وہ کاشتکاری میں جُت گیا.. دادی نفیسہ خاتون اب بھی مویشیوں کو ہانک سکتی تھیں اور بھیڑوں کی دیکھ بھال کر سکتی تھیں..

وہ ہمیشہ سے یہاں نہیں رہتے آئے تھے..

یہ ایک نو آبادی تھی..

تاتاریوں کے علاوہ ہمیشہ سے چیچنیا کے باشندوں کو بھی خودسر اور شورش پسند گردانا جاتا تھا کہ یہ لوگ مرکز کا تسلّط برداشت نہیں کرتے تھے اور ہمہ وقت بغاوت پر آمادہ رہتے تھے.. اس مسئلے کا حل جوزف سٹالن نے اپنے مخصوص انداز میں کیا اور چیچنیا کی بیشتر آبادی کو زبردستی ٹرکوں پر ٹھونس کر دور دراز کی سوویٹ ریاستوں میں بکھیر دیا اور ان پر پابندی لگا دی کہ وہ ان ریاستوں سے باہر کبھی بھی قدم نہیں رکھ سکتے.. اس کے باوجود بہت سے خاندانوں نے اپنے آبائی وطن لوٹنے کی کوشش کی.. پکڑے گئے اور پھر سائبیریا کے بیگار کیمپوں میں مشقت اور سردی کا شکار ہوئے.. ایک عرصے بعد حکومتی پالیسی میں تبدیلی ہوئی تو انہیں وطن واپس جانے کی اجازت ملی..

طویل قیام کے باوجود.. مقامی لوگوں میں شادیاں کرنے کے باوجود اُن ریاستوں میں چیچنیا کا کوئی ایک باشندہ بھی ایسا نہ تھا جس نے وہاں ٹھہرنے کو ترجیح دی ہو.. ابوطالب کے ماں باپ اور عزیز واقارب جب وطن لوٹے تو اُن کے آبائی گھروں کی جگہ کئی منزلہ فلیٹ تعمیر ہو چکے تھے.. پگڈنڈیوں کی جگہ شاہراہوں نے لے لی تھی اور وہاں رُوسی اور یوکرین نژاد باشندے ایک عرصے سے آباد تھے... بلکہ اب وہاں اُن کی دوسری نسل کی اجارہ داری تھی جو اپنے آپ کو چیچنیا کے شہری گردانتے تھے..

ابوطالب کے خاندان کو اپنے آبائی گاؤں سے سینکڑوں کلومیٹر دُور داغستان کی سرحد کے قریب یہ تنگ وادی بے آباد ملی اور وہ اس میں آباد ہو گئے..
ابوطالب یہیں پیدا ہوا اور اس کے باپ نے گھر سے باہر نکل کر بندوق سے متعدد فائر کر کے وادی والوں کو خبر کی کہ اس کے ہاں ایک پہاڑی عقاب کی پیدائش ہوئی ہے..

اس وادی میں امام شامل کی شجاعت کے قصّے دوہرائے جاتے تھے..



اُن کے نام کی قسم کھائی جاتی تھی..

ابوطالب ان قصّوں کو برف آلود راتوں میں دادی نفیسہ سے سنتا جوان ہوا تھا.. وہ اکثر اُسے داغستان کے شاعر رسول حمزہ کی وہ نظم سنایا کرتی تھیں جو اس نے شرمندگی کے بوجھ تلے دب کر لکھی تھی۔

رسول نے اپنی جوانی میں سوویت پروپگنڈے سے متاثر ہو کر کہ امام شامل دراصل برطانیہ اور ترکی کے جاسوس تھے جن کا کام قوموں کے درمیان نفرت کی ہوا دینا تھا اُن کی تکذیب میں ایک ہجو لکھی تھی اور اپنے تئیں امام شامل کا "پردہ فاش" کیا تھا... پھر وقت کے گزرنے سے 'جوانی کا بخار اُترنے سے.. اور ہم وطنوں کے چہروں پر اس نظم نے جو دُکھ لکھ دیا تھا اسے پڑھتے ہوئے.. اسے احساس ہوا کہ یہ ایک حماقت تھی.. اس کے والد بھی اکثر بُڑبُڑاتے "رسول.. امام شامل سے مت اُلجھو.. اگر تم نے ایسا کیا تو زندگی بھر سکون نہ پا سکو گے.."

یہ دُعا تھی یا بددُعا لیکن رسول حمزہ کو تب تک چین نہ آیا جب تک اس نے ایک اور نظم لکھ کر امام شامل کے سامنے ایک مجرم کی مانند سر جھکا کر معافی نہ مانگ لی..

نفیسہ خاتون ابوطالب کو یہی نظم سنایا کرتی تھیں....

برسوں پہلے 'دل پر میرے زخم لگا تھا
اب بھی نشتر بن کر جاگ اٹھتا ہے..
بوڑھا 'دِیر' بہادر
قفقازی ٹوپی اوڑھے دیکھ رہا ہے...
اک اونچی دیوار سے نیچے جھانک رہا ہے...
دائیں ہاتھ سے پکڑے اپنی دودھاری تلوار کا قبضہ..
دائیں جانب ڈال رہا ہے میان کا سایہ

.....

میں نے بھی باتوں میں آکر
اوروں کے ہمراہ چلائیں
شعروں کی شمشیریں اُس پر..
وہ تلوار اجداد کی میرے...
جو دشمن کے خون میں نہائی،
اُس کو میں نے،
لوگوں کی باتوں میں پڑ کر،
غدّاروں کا حربہ سمجھا...
دشمن کا ہتھیار بتایا...
اب بھی رات کی خاموشی میں..
اُس کے بھاری قدموں کی آہٹ ملتی ہے،
جب دیپک بجھ جاتے ہیں.
کھڑکی میں سے اس کا سایہ
وہ جس نے جم کر اخلگو کی آن بچائی...
گونیپ کا درویش سپاہی...
.. آجاتا ہے' خود میرے اپنے کمرے میں...
آجاتا ہے' اور یہ کہتا ہے
"کتنی جنگیں لڑتا آیا
کتنا خون بہایا میں نے
کتنا درد اٹھایا میں نے
میرے بدن پر' میری قبا پر
انیس زخموں کے پیوند اب بھی دیکھے جاسکتے ہیں



پھر بھی میں نے صبر کیا تھا
لیکن تم نے
شعروں کے یہ تیر چلا کر
زخم لگایا ہے ایسا
جیسا زخم کبھی نہ کھایا..
خنجر کے' تلوار کے اور گولی کے زخم ایک طرف
اور یہ زخم ایک جانب
یہ پہلا زخم ہے جو میں نے
اپنے کوہستان کے ایک بیٹے کے ہاتھوں کھایا
تم نے وہ جو تیر چلایا
میرے دل میں جا اترا ہے..
ہو سکتا ہے غزوہ اور جہاد کے نعرے
اب فرسودہ سمجھے جائیں
لیکن میرے بچّے'
ان نعروں نے
اک دن تیرے
کوہستان کی حُرمت اور اُس کا ناموس بچایا
ہو سکتا ہے آج کی دنیا..
ان حربوں کو کہنہ سمجھے
لیکن یہ وہ حربے ہیں
جو آزادی کے ضامن بن کر
رن کے میدانوں میں چمکے

دشمن پر طوفان سے ٹوٹے
میں کوہستانی شاہین بن کر
ہر پل جنگ کے میدانوں میں لڑتا آیا..“
یوں ہی سحر تک وہ سایہ..
جو ہر شب اندھیارے میں
اپنی حنا آلود داڑھی
چہرے کی تابانی لے کر
میرے کمرے میں آتے ہی
...منڈلاتا ہے
طنز کے لاکھوں تیر چلا کر
مجھ کو اپنے زخم دکھا کر
شرم کا اِک احساس دلا کر
جانے کہاں پھر چھپ جاتا ہے..
میں نے جو حرکت کی تھی..
اُس حرکت پر نادم ہوں
اُس سائے سے بھی نادم
جو ہر شب تاریکی میں منڈلاتا ہے...

نفیسہ خاتون یہ نظم سناتی سناتی اپنی حقّے سے پہاڑی تمباکو کا آخری کش لگا کر اونگھ جاتیں..

ماسکو والے اگرچہ دہریے تھے اور ناپسندیدہ تھے لیکن اس کے باوجود اُن میں انتظامی صلاحیتیں ایسی تھیں کہ اُن کے دور افتادہ گاؤں میں بھی بجلی تھی..



اس لیے فریج تھے ٹیلی ویژن تھا اور ایک پکی سڑک ان کے گھروں تک آتی تھی.. یہ سب کچھ ہونے کے باوجود نفیسہ خاتون ایک گھڑی ایک الارم کلاک کی موجودگی برداشت نہ کرتی تھیں..ان کا کہنا تھا کہ اگر پہاڑوں کے بیٹوں کی کلائیوں پر گھڑیاں بندھی ہوں اور اُن کی تپائی پر الارم کلاک دھرے ہوں تو وہ صرف ان پر نظر کرتے رہتے ہیں اور آفتاب کی پہلی کرنوں.. چٹانوں کے بڑھتے ہوئے سایوں اور شاموں کے سحر کو نظرانداز کر دیتے ہیں..چنانچہ وہ گرمیوں کے موسم میں کھڑکی میں سے آنے والی خنک ہوا کو اپنے بوڑھے بدن پر محسوس کر کے اسے بیدار کر دیتیں کہ ابوطالب اُٹھو فجر کی نماز کا وقت ہو گیا ہے..اس طور وہ ان کے گھر کے عین سامنے جو چٹان بلند ہو کر وادی کو تنگ کرتی تھی اس پر چھاؤں کو اترتے ہوئے..ایک خاص پتھر تک اُترتے ہوئے دیکھ کر ظہر کی نماز کا تعین کرتی تھیں.. اور جب وہ چھاؤں چٹان کے دامن میں آجاتی تو عصر کا وقت ہوتا.. بھیڑیں شام اُترنے سے جب بے چین ہو کر باڑے کی جانب ممیاتی ہوئی چلنے لگتیں تو یہ مغرب تھی..اور مکمل تاریکی چھا جانے کے بعد جب وہ دُنبے کی چربی کے شوربے میں روٹی بھگو کر کھا چکتے تو یہ عشاء کا وقت ہوتا..اسی لیے قلعہ جنگی کے تہہ خانے کی سیڑھیوں پر اُترتی دھوپ اور چاندنی سے وقت کا اندازہ کر لینا ابوطالب کی اختراع تھی...

اُسے یقین تھا کہ اُس کی دادی اگرچہ اُس کی جدائی میں نڈھال.. ان سیڑھیوں پر اترتی دھوپ اور چاندنی کو دیکھ سکتی تو نماز کے اوقات کا اندازہ لگا سکتی تھی...اگر وہ اب تک زندہ تھی تو...اسے دہشت گرد قرار دے کر ہلاک نہیں کر دیا گیا تھا تو..

وہ اپنی بھیڑوں اور کاشتکاری میں مگن تھا جب ایک رات نفیسہ خاتون نے اس کے شانے کو جھنجوڑ کر اسے بیدار کیا ”غزوہ اور جہاد کے نعرے ابھی

فرسودہ نہیں ہوئے میرے بچے.. امام شامل میرے خواب میں آئے تھے اور وہ کہتے تھے کہ کوہستان کی حرمت اور ناموس کو بچانے کے لیے گروزنی پہنچو.."

گروزنی ابھی آباد تھا.. چیچنیا کا دل تھا.. ماسکو کا ہم پلّہ تھا.. اور وہ اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک کھنڈر میں بدل گیا..

جب اُسے روسی ٹینک ملبے کے ڈھیر میں بدل رہے تھے اور اس ڈھیر میں ہزاروں بچے بوڑھے اور عورتیں دفن ہو رہے تھے تو ابو طالب کے شانوں کے ساتھ شانہ ملائے کچھ مکمل اجنبی بھی تھے جو دور دیسوں سے آئے تھے.. ان میں عربی، پاکستانی، سوڈانی اور افغانی بھی تھے.. افغانی تعداد میں زیادہ تھے.. اور ان میں سے بہت سے گروزنی کے ملبے میں بے نام دفن ہوئے..

ابو طالب.. اگر قندوز میں تھا.. اور اب اس تہہ خانے میں تھا تو اس احسان کا بدلہ چکانے کے لیے تھا.. اگر یہ وہاں تھے تو اسے بھی یہاں ہونا چاہیے تھا.. انہوں نے اس کا ساتھ دیا تھا..

شمالی رُوسیوں کا ساتھ دے رہے تھے.. تو وہ کیسے اُن کا ساتھ دے سکتا تھا.. تو ابو طالب.. جسے چیچنیا کے حوالے سے چی چی بھی کہا جاتا تھا یہاں قلعہ جنگی کے ایک تہہ خانے میں تھا.. بے شک نیم مردہ تھا..

جب کہ باہر صبح ہو چکی تھی..

دُھوپ دوسری سیڑھی پر تھی..

گیارہ بج چکے تھے..

اور ایک گھوڑا مردہ پڑا تھا..



دُھوپ تیسری سیڑھی پر براجمان تھی..

اُوپر.. کچے صحن میں بکھری لاشوں میں سے ابھی تک بھاپ اُٹھ رہی تھی..

وہ نڈھال پڑے تھے لیکن ان سب کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ گھوڑے کی جانب دیکھتی تھیں.. بُھوکی آنکھیں ایک مردہ گھوڑے میں سے زندگی کی بینائی تلاش کرتی تھیں.. اور چی چی کی آنکھیں ایسی تھیں کہ بھوک سے مرنے والی تھیں اور وہ زندگی کی آوازیں تھیں اسی لیے چی چی نے بولنے کی ہمت کی "اسے کھایا کیسے جائے؟"

عبدالوہاب کے جثّے میں تھوڑی سی کپکپاہٹ ہوئی، وہ بہت دیر سے اوندھا پڑا تھا اور اسے بہت دیر لگی سیدھا ہونے کی کوشش میں۔ اس کے منہ میں مٹّی بھری ہوئی تھی۔ یہ مٹّی بہت دیر سے اس کے منہ میں تھی لیکن ابھی تک نم ہو کر کیچڑ میں نہیں بدلی تھی کیونکہ اس کے منہ میں لعاب کب کا خشک ہو چکا تھا، جن خلیوں سے وہ پھوٹتا تھا وہ مردہ ہو چکے تھے اس لیے مٹّی ابھی تک خشک تھی.. عبدالوہاب نے اس مٹّی کو تھوکنے کی سعی کی تو وہ غبار بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے تن گئی اور وہ کھانسنے لگا..

تھوڑی دیر بعد اس نے اپنے پر قابو پایا اور اٹک اٹک کر بولا "یہ.. حلال ہے؟"

مرتضیٰ بیگ کی گویائی کو شدید غصے نے ابال کر رواں کر دیا "یہ تم نے پہلے بھی پوچھا تھا وہاب.. اور میں نے کہا تھا کہ اگر حلال نہیں تو کیا تم اسے نہیں کھاؤ گے اور تم نے کہا تھا.. پھر بھی کھاؤں گا... کہا تھا یا نہیں؟"

"کیا پتہ میں نے کیا کہا تھا اور تم نے کیا جواب دیا تھا.. کچھ یاد نہیں... مجھ سے جھگڑو مت مرتضیٰ.. ہم یہاں اس تہہ خانے میں کب آئے تھے.. کتنے روز ہو گئے ہیں.. کچھ یاد ہے؟"

"نہیں.. اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ ہم یہاں کب آئے تھے لیکن ہم یہاں آکر کہیں جانے کے لیے نہیں آئے.. سمجھ لو کہ ہم یہیں پیدا ہوئے تھے.. اور گھوڑا مکروہ ہوتا ہے اور اسے کھایا جا سکتا ہے.. اور تم تو شرعی احکام کو مجھ سے بہتر جانتے ہو.. اپنی زبان میں انہیں پڑھ کر درست نتیجے پر پہنچ سکتے ہو.. اور ہم تو جس راستے پر تم چلاتے ہو آنکھیں بند کر کے چلتے جاتے ہیں تو تم یہ بھی تو جانتے ہو کہ مجبوری کی حالت میں حرام بھی حلال کر دیا گیا ہے.."

"ہی ہی.. ہو ہو.. ہی ہی.." اللہ بخش کی غیر تہذیب یافتہ ہنسی کی آواز گونجی "اگر ہم مجبوری کی حالت میں نہیں ہیں تو اور کون ہے.. بھائی مرتضیٰ مجھے وہ گانا یاد آ رہا ہے کہ ؎ عشق میں کیسی مجبوری... وہ گانے والی اس تہہ خانے میں ہوتی ناں تو اس کو لگ پتہ جاتا کہ عشق میں کیسی کیسی مجبوری ہوتی ہے.. نہیں؟"

عبدالوہاب اس حوالے کو سمجھ نہ پایا اور بولا "ہاں مجبوری کی حالت میں حرام کھانے کی بھی اجازت ہے گھوڑا تو پھر بھی مکروہ ہے.. لیکن ہم اسے شوٹ کرنے کی بجائے حلال کر لیتے تو اچھا نہ تھا.."

"ڈونٹ وَری.." جانی نیلے ڈرموں کی اوٹ میں پڑا تھا وہاں سے اس کی خفیف سی آواز سنائی دی "میں نے اسے شُوٹ کرنے سے پیشتر بسم اللہ پڑھ لی تھی، اسے حلال ہی سمجھو.."



"لیکن یار اوہ تو شکار کے لیے اجازت ہے.. جنگل کا جانور اور پرندہ کے لیے.."

"خان صاحب ہم نے اسے شکار ہی تو کیا ہے قلعہ جنگی کے لاشوں کے جنگل میں.. آ جاؤ.."

وہ سب اپنے اپنے مقام سے کسی ڈراؤنی فلم میں قبروں سے اٹھنے والے مردوں کی مانند اپنے بھوکے ڈھانچے گھسیٹتے ہوئے اٹھے.. رینگتے ہوئے... مرتضیٰ۔ وہاب اور چی چی کے پاس پہنچنے لگے جو گھوڑے کے نزدیک تھے..

البتہ ہاشم میر جہاں پڑا تھا وہیں پڑا رہا.. ہلا جلا نہیں.. باقی سب حرکت میں آئے لیکن وہ بے حرکت رہا..

"اسے جھنجوڑو.." مرتضیٰ چی چی سے مخاطب ہوا "زور زور سے جھنجوڑو.. انسان اگر کئی روز سے بھوکا پیاسا ہو تو نقاہت اسے ایک مرگ غنودگی میں لے جاتی ہے جہاں سے بعض اوقات واپسی نہیں ہوتی.. اُسے جھنجوڑو"

چی چی سے شاید اٹھا نہ گیا اور اُس نے وہیں سے لڑکھڑاتی آواز میں کہا "اگر وہ اس حالت میں ہے تو خوش بخت ہے۔ اُس کا امتحان ختم ہو گیا.... کیا فائدہ اُسے مزید اذیت دینے کا.. اسے غنودگی میں ہی مر جانے دو"

"ابو طالب.. پلیز ہمت کرو اور اُسے تھوڑا سا جھنجوڑو تو سہی.. یہ کتنی دُور سے یہاں آیا ہے.."

ابو طالب چی چی اٹھا نہیں ایک چوپائے کی مانند گھسٹتا ہوا ہاشم کے قریب ہوا اور اس کا کندھا پکڑ کر ہولے ہولے ایک افیمی کی مانند ہلانے لگا کہ سکت بس اتنی ہی تھی.. وہ بے حد ٹھنڈا لگ رہا تھا.. جیسے ڈیپ فریزر میں ہو"... اس کا امتحان واقعی ختم ہو گیا ہے.. میرا خیال ہے مر گیا ہے.."

"نہیں.. نہیں.." ہاشم کے منجمد لب کھلے اور چی چی نے نہیں دیکھا تھا

کہ اس کی آنکھیں بھی کھلی ہیں.. اور تاریکی میں یہ بھی نظر نہیں آتا تھا کہ وہ روتے روتے سرخ ہو چکی ہیں "میں ابھی ہوں.. مجھے جگاؤ تو نہیں.."

چی چی یکدم خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا..

"میں پھر سے گھر جانا چاہتا ہوں.. میں گھر میں تھا اور تم نے مجھے جگا دیا.. میرے کمرے میں گیس ہیٹر جل رہا تھا اور میرے بدن کے ایک ایک روئیں میں اُس کی گرمی اُترتی تھی اور مجھے سُکھی کرتی تھی.. ماں میرے لیے گرم دودھ لینے گئی تھی اور تم نے مجھے جگا دیا.. اب میں پھر سے سرد ہونے لگا ہوں.. مجھے سونے دو"

مرتضٰی بیگ عمر میں اُن سب سے بڑا تھا.. کم از کم دس برس بڑا تھا اسی لیے اپنے آپ کو اُن سب کے لیے ذمہ دار سمجھتا تھا... اُن سے کہیں زیادہ نقاہت کا مارا ہوا اور نڈھال تھا اور بچّوں کی طرح اُنہیں ڈانٹتا بھی تھا اور اُن کا خیال بھی رکھتا تھا.. وہ بمشکل اُٹھا اور ہاشم کے پاس جا بیٹھا.. "ہاشم..... ہمت کرو"

"مجھے سونے دو.."

"ہاشم.. اِٹس ڈنر ٹائم.."

ہاشم جو ابھی اونگھتا کسمساتا تھا اپنے آپ کو سنبھالتا اٹھ بیٹھا "میری ماں بھی یہی کہا کرتی تھی.. اِٹس ڈنر ٹائم.."

"میں ماں ہوں ہاشم.. اٹھو.." اس نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا "آجاؤ.."

ہاشم نے نیند سے بیدار ہونے والے ایک بچّے کی مانند دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے.. ایک چی چی کی گرفت میں آیا اور دوسرے کو مرتضٰی نے جکڑ لیا اور وہ اسے گھسیٹتے ہوئے "ڈنر" کے پاس لے آئے..

"ڈنر" بہت بڑا اور اکڑا ہوا تھا اور اس کی چاروں ٹانگیں زمین سے اُٹھی ہوئی لگتی تھیں...



جانی اُن سے ذرا الگ تھا.. اللہ بخش۔ وہاب اور گل شیر اس کے قریب تھے..

"گھوڑے کو کیسے اور کہاں سے کھایا جاتا ہے یارا.." گل شیر شاید کوشش کر چکا تھا "اس کا جلد تو بہت سخت ہے چمڑے کے موافق ہے اس میں دانت گاڑھ کر گوشت کا بوٹی تو الگ نہیں کیا جا سکتا.."

"تم نے کوشش کیا ہے خاں صاحب.."

"نہیں یارا.. بس ہاتھ لگا کر اندازہ کیا ہے.. چمڑے کے موافق ہے.. کیسے کھائے گا؟"

"یہ ڈنر تو نہیں ہے.." ہاشم نے ہاتھ بڑھا کر اُسے چھوا.. "یہ تو ٹھنڈا ہے" وہ ابھی تک نیم غنودگی کی کیفیت میں تھا..

مرتضٰی بیگ نے اپنی بیلٹ میں سے ایک چھوٹا سا خنجر نکالا جو اس نے کلوز کومبیٹ یعنی دست بہ دست لڑائی کے لیے سنبھال رکھا تھا اور اس کی دھار پر ابھی تک اس شخص کا خون جما ہوا تھا جو قندوز میں اس کی خندق میں کود کر اس کے گلے کی جانب ہاتھ بڑھاتا تھا "بہت برس پہلے جنوبی امریکہ کے برف پوش پہاڑی سلسلے اینڈیز میں ایک جہاز کریش ہوا تھا.. اور چند ایک جو بچ گئے تھے انہوں نے مجبوراً اپنے مردہ ساتھیوں کا گوشت کھا کر اپنے آپ کو زندہ رکھا تھا..... ایک ناول لکھا گیا تھا "الائیو"... میں نے وہ ناول پڑھا تھا.. نہ پڑھتا تو آج یہ نہ جانتا کہ ہمیں کیا کرنا ہے.. جو زندہ بچ گئے تھے انہوں نے اپنے ساتھیوں کی لاشوں کے چربیلے حصے چاقو سے کاٹ کر.. ان کے باریک پارچے تراش کر انہیں نگل لیا تھا.. ہم بھی ایسا ہی کریں گے.."

"واللہ.." عبدالوہاب بولا "اوپر تہہ خانے کی چھت کے اوپر صحن میں جو ہمارے رفیق پڑے ہیں تو بیکار پڑے ہیں.. ہم ان کا گوشت کیوں نہ کھالیں.. وہ

اس گھوڑے سے تو کہیں نرم ہو گا..“

”وہاب..“ مرتضٰی جھنجلا گیا ”ابھی تم اس گھوڑے کے حرام یا حلال ہونے کے بارے میں تشویش میں مبتلا تھے اور ابھی تم اپنے دوستوں کی لاشیں کھا جانے کے بارے میں سنجیدہ ہو رہے ہو..“

”نہیں..“ وہاب کا چہرہ اندھیرے کے باوجود پیلا پڑ گیا اور دکھائی دیا ”میرے اندر کڑواہٹ بھر گئی تھی اور میں ایک بھونڈا مذاق کرنے کی کوشش کر رہا تھا.. میں کسی بھی لاش کی.. اور اپنے کسی رفیق کی لاش کی بے حرمتی کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا.. زندگی مجھے قطعی طور پر عزیز نہیں اور اتنی عزیز نہیں کہ میں اپنے ساتھیوں کے مُردے کھا جاؤں.. میں تو.. بیوقوفی میں ایک مذاق کر رہا تھا..“

”تم اگر مذاق سے فارغ ہو جاؤ تو میں گھوڑے کے پارچے تراشنے کی کوشش کروں اگرچہ یہ مکروہ ہے“ مرتضٰی شدید غصے میں تھا ”اس جانور کی پشت پر بیٹھے ہوئے کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ اس کی جلد کا چمڑا اتنا سخت ہو گا کہ اسے ایک خنجر سے کاٹنے کے لیے بھی اتنا زور لگانا پڑے گا.. تم سب خاموش ہو گے تو میں یہ کوشش دوبارہ کروں گا..“

وہ سب وہاب کے سوا بولے تو نہیں تھے لیکن مرتضٰی طیش میں تھا اس لیے چپ رہے۔ ادھر اُدھر سرک کر ڈھے گئے.. ویسے بھی ان میں جتنی سکت تھی وہ گھوڑے کے قریب آنے میں اور کچھ کہنے میں صرف ہو چکی تھی..

مرتضٰی اپنے مختصر خنجر کو ایک آری کی مانند مسلسل چلا رہا تھا لیکن گھوڑے کی جلد اتنی ڈھیٹ تھی کہ اس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا..

دھوپ اُٹھنے لگی تھی..

تیسری سیڑھی سے اٹھ کر پہلی سیڑھی تک واپس ہو چکی تھی..



مرتضٰی گھوڑے کے سخت اور سرد بدن پر خنجر کو چلاتا تھا اور جیسے اس کی دھار کُند ہو چکی تھی.. جیسے وہ سنگ مرمر پر چلتا ہوا اسے کاٹ نہ سکتا ہو.. پھسلتا ہو اور ایک خراش بھی نہ لگا سکتا ہو..

ہاشم پھر سے اونگھنے لگا تھا اور بریڈ فورڈ میں اپنے گھر کے دروازے کے باہر کھڑا تھا.. جس کے اندر اس کے کمرے میں گیس ہیٹر جل رہا تھا اور وہ جلد از جلد سردی سے اکڑے ہوئے اپنے بدن کو اس کے قریب لے جانا چاہتا تھا..

جانی لاتعلق تھا..

البتہ چی چی۔ وہاب۔ اللہ بخش اور گل شیر نتیجے کا انتظار کر رہے تھے..

تب ان کے کانوں میں کچھ انسانی آوازیں آئیں..

وہ دم روکے ایک سکوت بھرے سناٹے میں چلے گئے..

کون ہو سکتا ہے؟..

اوپر کچّے صحن میں کچھ لوگ چل پھر رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے..

تہہ خانے کی چھت پر ان کے قدم پڑتے تھے تو ان کی دھمک سنائی دیتی تھی..

اُن کی باتیں.. بلکہ باتوں کی بھنبھناہٹ پہلی سیڑھی پر جا چکی دھوپ کو روندتی ہوئی نیچے تہہ خانے میں آ رہی تھی..

اُن میں سے کسی ایک کا سایہ پہلی سیڑھی کی دُھوپ میں سے گزرتا تھا..

مرتضٰی کا خنجر گھوڑے کی پشت پر جہاں تھا.. رُکا رہا..

اُن سب کی نظریں پہلی سیڑھی کی دھوپ پر چپکی ہوئی تھیں..

کسی بھی بدقسمت لمحے اس سیڑھی پر کوئی بوٹ یا جوگر پڑ سکتا تھا اور نیچے اُن تک آ سکتا تھا..

وہ سبھی مسلح نہ تھے..

انہوں نے تو اپنے ہتھیار ڈال دیئے تھے..

ہاتھوں کو پشت پر باندھنے کی جو کارروائی شروع ہوئی تھی اس کے فوراً بعد بھگدڑ میں ان کے ہاتھ صرف تین کلاشنکوفیں لگی تھیں..

انہیں اپنے آپ کا پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں پڑے ہیں.. ان کا کیا پتہ ہوتا کہ وہ تہہ خانے میں کہاں پڑی ہیں..

لیکن ان میں انہیں گھوڑے کی سرد ہو چکی لید اور پیشاب میں سے ٹٹول کر ان کی نالیوں کا رُخ پہلی سیڑھی کی دُھوپ کی جانب کرنے کی توانائی آ گئی..

وہ دم روکے اپنی آنکھیں پہلی سیڑھی پر ثبت کیے منتظر رہے..

یہاں تک کہ ہاشم بھی غنودگی سے مکمل طور پر باہر آ گیا.. اپنے گھر کے دروازے سے واپس آ گیا..

شاید وہ لاشیں اُٹھا رہے تھے..

یا اُن کے بُوٹ اور سونے کے دانت اتار رہے تھے..

یا لاشوں کے اس پارک میں چہل قدمی کے لیے آ گئے تھے..

تہہ خانے میں ایک حدّت بھرے گھر کی آسودگی ہو گئی.. ان کے زخم مندمل ہو گئے..

ان کے بدنوں میں جو گولیاں ٹھہری ہوئی تھیں جو آہنی ٹکڑے پناہ گزیں تھے وہ گھل گئے اور وہ پہلی سیڑھی پر نظریں جمائے ہوشیار اور چوکنے ہو گئے..

مرتضٰی کا خنجر اُس کی گرفت میں گھوڑے کی پشت پر رُکا رہا..

سانس بھی شاید رُکے رہے..

تھوڑی دیر بعد.. جب ان کے حساب میں صدیاں درج ہو گئیں تو پہلی سیڑھی کی دُھوپ میں سے جو ایک سایہ بار بار گزرتا تھا بہت دیر تک نہ گزرا.. آوازوں کی بھنبھناہٹ ختم ہو گئی.. تہہ خانے کی چھت پر جو چلتے پھرتے باتیں



کرتے تھے چلے گئے.. اُوپر پھر سے خاموشی ہو گئی.. اس خاموشی کے پھیلتے ہی جنہوں نے ہتھیار اٹھا رکھے تھے ان کے بازوؤں میں ذرّہ برابر سکت نہ رہی اور وہ نیم مردہ ہو کر لٹک گئے.. ابھی وہ تنے ہوئے اور مضبوط تھے اور جونہی خطرہ ٹل گیا اور وہ پھر سے لاغر ہو گئے..

مرتضٰی نے بہت دیر تک کان لگائے رکھے کہ شاید ابھی کوئی اُوپر ہو لیکن وہاں صرف سکوت تھا.. اس نے جس کام میں وہ جُتا ہوا تھا پھر سے جاری کر لیا اور خنجر کو گھوڑے کی جلد پر ایک آری کی مانند چلانے لگا..

"یارا جب گھوڑے کا زین کستا ہے تو اس کا نچلا حصہ نرم لگتا ہے.. اُدھر کوشش کرو" گل شیر نے مشورہ دیا..

مرتضٰی نے اس کے مشورے پر فوراً عمل کیا کیونکہ وہ اس پتھر کو کاٹتے کاٹتے اکتا چکا تھا اور اُس کی انگلیاں تھک گئی تھیں.. زیریں حصے پر خنجر رکھتے ہی اُسے احساس ہو گیا کہ یہ نسبتاً نرم ہے اور یہاں کامیابی کا امکان ہے..

پہلی سیڑھی تاریک ہو گئی..

جِلد کے اندر جب گوشت تک دھار پہنچی تو مرتضٰی پہلی بار پشیمان ہوا کہ وہ یہ کیا کر رہا ہے.. جنگڑوں کی مانند ایک مردہ جانور کے گوشت کو کھانے کے لیے کاٹ رہا ہے.. لیکن یہ پشیمانی انتہائی عارضی تھی.. مردہ اور برف ہو جانے کے باوجود گھوڑے کے کچے گوشت میں سے ایک توانا اور اشتہا انگیز بُو آئی جو تہہ خانے کی بھوکی ہوا میں رچنے لگی.. اور اُس کا منہ پانی سے بھر گیا.. آج تک کسی کچّی ہانڈی میں دیسی گھی سے بُھنتے گوشت میں سے بھی ایسی لذّت بھری مہک نہ آئی تھی..

ناکیں اس مہک کی خبر پاتے ہی بے چینی سے سکڑنے لگیں..

ہر ایک کے منہ میں پانی بھرنے لگا.. یہاں تک کہ عبدالوہاب کے منہ

میں جو سوکھی مٹی تھی وہ بھی سیراب ہونے لگی..

جانی ان سے الگ تو نہ تھا اُس کے تالو میں بھی نمی کے ذرّے پھوٹنے لگے اور اُس کا سر شرمندگی سے مزید جھک گیا..

نیچے تہہ خانے میں تو شب کی سیاہی مسلسل تھی لیکن اب اُوپر پہلی سیڑھی کے اُوپر بھی گھنا اندھیرا پھیل چکا تھا.. اور یہ تب ہوا جب وہ گھوڑے کے گوشت کے لوتھڑے دونوں ہاتھوں میں تھامے انہیں اپنے منہ کے قریب لاتے تھے اور پھر اُبکائیاں لیتے..ان اُبکائیوں سے دوہرے ہوتے انہیں پرے کر دیتے..

اُن کے بدنی نظام میں کچھ بھی باقی نہ تھا ورنہ وہ قے بھی کر دیتے.. وہ پھر کوشش کرتے لیکن جونہی لوتھڑے کا ماس ان کے لبوں کو چھوتا تو وہ پھر ابکائیاں لیتے لیتے نڈھال ہو جاتے..ان کے گلے میں ایک سوکھی خرخراہٹ شروع ہو جاتی..

صرف جانی تھا جو ابھی تک اپنی ضد پر قائم تھا.. اگرچہ اُس کے بدن کی بھوک بغاوت کرتی تھی..

ایک مرتبہ پھر مرتضٰی ان کی مدد کو آیا "یہ بہت آسان ہے.. آنکھیں بند کر کے اسے زبردستی منہ میں گھسیڑ لو اور پھر آہم کر کے نگل لو.. جیسے ندیدے کتّے گوشت کو نگلتے ہیں.. اور پھر منہ پر ہاتھ رکھ لو..اسے باہر نہ آنے دو.. ایک بار یہ اندر چلا گیا تو پھر باہر نہیں آئے گا.. میں نے ایسا ہی کیا ہے.."

"تم نے کھا لیا ہے؟"

"ہاں.. یہ میرے اندر ہے.. بہت اتھل پتھل ہو رہی ہے لیکن اندر ہے.. کوشش کرو"

انہوں نے یہی حربہ آزمایا.. گھوڑے کے جمے ہوئے خون میں لتھڑے پارچے حلق میں اتار کر نگل لیے اور پھر منہ سختی سے بند کر کے بیٹھ گئے کہ پتہ نہیں اب کیا ہو گا لیکن حیرت انگیز طور پر اُن کے خالی معدوں نے انہیں اگلا نہیں..



قبول کر کے سنبھال لیا..

"جانی..." مرتضٰی نے ایک لوتھڑا اس کے منہ کے قریب کیا "بیٹے.. منہ کھول دو.. پلیز کوشش کرو.."

"نہیں.." جانی نے منہ پرے کر لیا کہ کہیں بھوک اُسے مجبور نہ کر دے

"مجھے بیٹا مت کہو.. تم میری ماں نہیں ہو.. میں ایک گھوڑے کو نہیں کھا سکتا.. مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ عقیدہ اختیار کرنے پر مجھے ایک مردہ گھوڑا کھانا ہو گا... قرآن اور حدیث میں یہ کہیں درج نہیں ہے.."

"مجبوری کی حالت میں.. جان بچانے کی خاطر گدھے کو کھا لینا بھی جائز ہے جانی.. یہ تو پھر گھوڑا ہے..اس میں عقیدے کا کوئی عمل دخل نہیں.."

"نہیں بیگ.." جانی نے کپکپاتے ہاتھ سے لوتھڑے کو پرے کر دیا "میں تمہارا شکر گزار ہوں لیکن نہیں.. میں مر جاؤں گا لیکن ایک گھوڑے کو نہیں کھاؤں گا..."

باہر رات مکمل ہو گئی تھی..

رات مکمل ہوئی تو مکر چاندنی اُترنے لگی.. پہلی سیڑھی پر آ گئی..

چی چی نے قے کر دی تھی اور گوشت کے ریشے اُس کے کھلے منہ سے لٹکتے ہوئے فرش پر بُو پھیلاتے ہوئے گرتے جاتے تھے..

اللہ بخش سو چکا تھا اور اُس کے خراٹے بلند ہو رہے تھے..

گل شیر ولی ایک مطمئن حالت میں اوندھا پڑا تھا..

عبدالوہاب پہلی سیڑھی پر نظریں جمائے سب سے لاتعلق ہو چکا تھا..

ایک نیلے ڈرم کی اوٹ میں جانی دیوار سے ٹیک لگائے الگ ہو چکا تھا.. وہ ایک احساس جرم کے تحت مسلسل گھوڑے کے زیریں حصے کی جانب دیکھ رہا تھا جہاں ایک بڑا گھاؤ تھا اور اُس کی دو پسلیاں نظر آ رہی تھیں.. جہاں سے گوشت کاٹا

گیا تھا.. پارچے تراشے گئے تھے.... اُس نے کبھی کسی گھوڑے کو اس حالت میں نہ دیکھا تھا.. اتھاہ تاریکی میں بھی گھوڑا اور وہ خون آلود گھاؤ اسے صاف نظر آرہا تھا.. اُسے یکدم احساس ہوا کہ شاید عشاء کا وقت ہو گیا ہے اور چی چی نے ابھی تک اذان نہیں دی تھی.. وہ باقاعدہ اذان تو نہیں دیتا تھا جتنی اس میں ہمت ہوتی تھی اس حساب سے وہ تقریباً سرگوشی میں "حیّ اللفلاح.. حیّ اللفلاح." کہہ دیتا تھا اور وہ جب سے اس تہہ خانے میں آئے تھے اس قابل تو نہیں رہے تھے کہ باقاعدہ نماز ادا کر سکیں.. کبھی تیمّم کر لیتے تھے اور کبھی جس بھی حالت میں ہوتے تھے اشاروں سے نماز ادا کر لیتے تھے.. ابو طالب چی چی اپنی دادی نفیسہ خاتون کی پیروی میں نماز کے وقت کا تعین کرتا تھا.. اُوپر پہلی سیڑھی کے اوپر جب تاریکی ہلکی ہونے لگتی تھی تو یہ فجر کا وقت ہوتا تھا.. دُھوپ تیسری سیڑھی سے سمٹ کر پہلی سیڑھی پر اُٹھتی تھی تو ظُہر... اور جب دھوپ کے سائے بڑھتے گئے تھے تو عصر... مغرب کا تعین نیم تاریکی کرتی تھی اور اس کے بعد جب تاریکی مکمل ہو رہی ہوتی تھی تو یہ عشاء کا وقت ہوتا تھا.. اور وہ باقاعدگی سے سب کو ایک سرگوشی میں فلاح کی جانب بلانے لگتا تھا..

آج اس نے کوتاہی کر دی تھی..

اسے اتنی ہوش ہی نہ تھی.. اس کے منہ سے ریشے لٹک رہے تھے اور وہ سر جھکائے کبھی انہیں نگلتا تھا اور کبھی اگلتا تھا..

جانی نے دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے عشاء کے چار فرضوں کی نیت کر لی..

اگرچہ مرتضیٰ کا معدہ بھی بغاوت پر آمادہ تھا لیکن وہ اُسے اپنی قوت ارادی سے بمشکل سنبھال رہا تھا..

لیکن ایک تبدیلی ضرور رونما ہوئی.. جانی کے سوا سب نے.. جو نگل چکے تھے یا اگل رہے تھے اُن سب نے بھوک کے کانٹوں کے درمیان توانائی کا



ایک چھوٹا سا پھول کھلتے محسوس کیا..

"ہاشم... ابھی ابھی جب تم ایک مرگ غنودگی میں اُتر گئے تھے اور بیدار نہیں ہونا چاہتے تھے.. اپنے گھر چلے گئے تھے.. چلے گئے تھے ناں؟" مرتضیٰ نے پوچھا..

"ہاں.. میں وہاں تھا اور تم لوگوں نے زبردستی مجھے جگا دیا.. میرے کمرے میں... بریڈ فورڈ انگلستان میں میرے کمرے میں گیس ہیٹر جل رہا تھا اور میں اس کی گرم آسودگی میں تھا جب تم نے مجھے جگا دیا.." ہاشم کے منہ میں بھی ابھی تک گھوڑے کے جمے ہوئے خون والے سخت لوتھڑے تھے جو نگلے نہیں جا رہے تھے..

"ہاں میں وہاں تھا.."

"تو تم اپنے گھر سے کیسے نکلے.. اس تہہ خانے میں کیسے آ نکلے.."

"جیسے سب آ نکلے.. میں تم سے مختلف تو نہیں ہوں"

"تم ہو.. یا پھر جانی ہے.. باقی ہم سب تو ایسے معاشروں میں سے آئے ہیں جہاں کی اکثریت مسلمان ہے.. پیدائش سے لے کر موت تک ہم اس کے تابع ہوتے ہیں.. مثبت کے ساتھ ساتھ ہم منفی اثرات بھی قبول کرتے جاتے ہیں.. لیکن تم اور جانی ایک الگ جہان کے باشندے ہو.. تم یہاں کیسے آ گئے؟"

"آپ بتاؤ مرتضیٰ بیگ.. میں نے سنا ہے کہ تمہارا باپ ایک مجاہد ہے.. ملک کا ایک بڑا صنعت کار اور امیر کبیر شخص ہے.. اور تم مرسیڈیز اور بی ایم ڈبلیو سے کمتر کاروں میں قدم رکھنا اپنی ہتک سمجھتے تھے تو تم کیسے آ گئے؟"

"میں.. ایک کفارہ ادا کرنے آیا ہوں.."

"میری اردو اتنی اچھی نہیں کہ میں کفارہ کا مطلب سمجھ سکوں.."

"بس یوں سمجھ لو ہاشم.. کہ میں اپنے بزرگوں کے کیے پر شرمندہ ہوں.. کچھ تلافی کرنا چاہتا ہوں.. اپنا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں.."

"شاید میں بھی اسی لیے.. اس تہہ خانے میں آیا ہوں...."

"اور شہادت کے لیے.."

"ہاں شہادت کے لیے بھی.. لیکن اس کے لالچ میں نہیں... یورپ کا پریس ہم جیسے برطانوی شہریوں کے یہاں آنے کا جواز یہ پیش کرتا ہے کہ ہم شہادت کے بعد جنّت میں ستّر حوروں اور شرابِ طہورا کے لالچ میں یہاں آتے ہیں.. مرتضٰی.. مغرب میں یہ سب کچھ اسی زندگی میں.. مرنے کے بغیر بھی آسانی سے حاصل ہو جاتا ہے.."

"تو پھر.."

"ہم تو حُوروں اور شراب کی بہتات سے تنگ آئے ہوئے ہوتے ہیں.... نہیں یہ نہیں کچھ اور جواز ہوتا ہے.. مغرب والے کبھی بھی جس کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتے.. میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں اکیس برس کا ہو گیا ہوں یا انہی دنوں ہونے والا ہوں اور میں نے کبھی بھی اپنے آپ کو اتنا مطمئن محسوس نہیں کیا جتنا اس تہہ خانے میں محسوس کرتا ہوں.. مجھے معلوم ہے کہ موت کے سوا اور کوئی میری راہ نہیں دیکھ رہا.. میری پسلیوں میں یا کہیں کولہے کی ہڈی کے نزدیک ڈیزی کٹرز کے ٹکڑے ہیں اور میں اتنا مجبور ہو چکا ہوں کہ مردہ گھوڑے کے پارچے نگلنے کی کوشش میں ہوں اور اس کے باوجود میں مطمئن ہوں.. مجھ میں کسی پچھتاوے کا عفریت نہیں پھنکارتا.. مجھے اگر دوبارہ زندگی ملے تو اُسے بھی شاید اسی طور بسر کروں اور اسی تہہ خانے میں پہنچوں.."

"لیکن تم یہاں تک آ کیسے گئے؟"

"میں؟" ہاشم نے منہ سے لٹکتے خون آلود ریشوں کو ہاتھ سے سمیٹتے ہوئے پھر سے منہ کے اندر دھکیلنے کی کوشش کی.. "میں؟"



وہ ایک عجیب مجرمانہ ذہنیت کا شخص ہے..

کسی کو اپنے باپ کے بارے میں ایسا نہیں کہنا چاہیے لیکن وہ ایسا ہی ہے۔

اور میں اُس کو ایک مجرمانہ ذہنیت کا شخص کہتے ہوئے بالکل شرمندہ نہیں ہوں.. میں نے ہمیشہ اُس کی جائز اور ناجائز خواہشوں کے سامنے سر جھکائے رکھا کہ میں اپنے والدین کے ساتھ نرمی برتنے اور اُن پر احسان کرنے میں یقین رکھتا تھا..

میری ماں میرے باپ کی طرح ایک اَن پڑھ خاتون ہے.. ایک ایسی وفادار خاتون ہے جو اپنے خاوند کے کردار پر تنقید کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی.. اور جب میں اور میری اکلوتی بہن اپنے باپ کے بارے میں کسی بھی شک کا اظہار کرتے تھے تو وہ ہمیں ڈانٹتی تھی اور خفا ہو جاتی تھی.. اور ہم اُسے خفا نہیں کر سکتے تھے کہ اُس گھر میں وہ ہمارا واحد آسرا تھی... میری بہن جونہی سکول سے فارغ ہوئی میرے باپ نے میرپور کے کسی گاؤں سے اپنا ایک دُور پار کا عزیز لڑکا امپورٹ کر کے اُس کی شادی کر دی.. وہ گھر سے بھاگ جانا چاہتی تھی.. اس کی ایک ہم جماعت پاکستانی لڑکی نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ اس اَن پڑھ لڑکے کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دے.. برطانوی قانون اُس کے حقوق کی حفاظت کرے گا لیکن اس کے جینز کے اندر کہیں اپنی ماں کی غیر مشروط وفاداری کے جرثومے تھے اور وہ ایسا نہ کر سکی...

میرا باپ تقریباً تیس برس پیشتر میرپور کے ایک گاؤں کی تنگدستی سے نکل کر غیر قانونی طور پر برطانیہ میں سمگل ہوا تھا..

اُس کی تمامتر انرجی برطانوی ویل فیئر سسٹم میں جو بچ نکلنے کی صورتیں ہیں جو درزیں ہیں ان کا فائدہ اٹھا کر.. رعایتیں حاصل کرنے میں گزری ہے..

وہ بے شک کام پر ہو تب بھی وہ ڈیکلیئر کرتا تھا کہ میں بیکار ہوں اور ویل فیئر کے چیک وصول کرتا تھا.. ماں کو اپاہج قرار دلوا کر اس کی دیکھ بھال کے لیے حکومتی اور معاشرتی بہبود کی انجمنوں سے باقاعدہ رقم حاصل کرتا تھا.. برطانوی قانون میں جہاں کہیں بھی کوئی گنجائش ہوتی تھی وہ اُس سے فائدہ اٹھاتا تھا.. اور اس پر فخر کرتا تھا اور کہتا تھا کہ اگر گنجائشیں موجود ہوں تو اُن سے فائدہ نہ اٹھانا کم عقلی ہے.. اور ماں اُسے حق بجانب سمجھتی تھی اور کہتی تھی کہ وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے ہمارے لیے اور ہمارے روشن مستقبل کے لیے کر رہا ہے.. وہ اتوار کے دن پورے شہر کا چکر لگاتا اور ربش ڈمپس میں طرح طرح کی ناکارہ چیزیں کار میں بھر کر لے آتا اور کہتا کہ دیکھو یہ گورے اتنے بیوقوف ہیں کہ اچھی بھلی کارآمد اشیاء کو پھینک دیتے ہیں.. اب بھلا ان پردوں میں یا ان دو کرسیوں میں کیا خرابی ہے.. ہمارا گھر اس قسم کے کاٹھ کباڑ سے بھرا پڑا تھا..

گھر پرانی وضع کا تھا اور اس کے تہہ خانے میں اُس نے سلائی کی تین مشینیں لگا رکھی تھیں جن پر بچّوں کے گارمنٹس تیار ہوتے تھے.. اس کام کے لیے بھی اُس نے دو غیر قانونی رکھے ہوئے تھے جو اُس تہہ خانے میں سوتے تھے.. وہ بالکل مزارعوں کی طرح تھے.. انہیں کوئی تنخواہ نہ دی جاتی تھی.. تہہ خانے میں سونے کے علاوہ بچی کھچی خوراک اُن کو دے دی جاتی تھی.. اور جب کبھی وہ شکایت کرتے تو میرا باپ انہیں پولیس کے حوالے کر دینے کی دھمکی دے کر چپ کرا دیتا.. ظاہر ہے ہم دیگر تارکین وطن کی نسبت زیادہ خوشحال تھے... لیکن یہ خوشحالی



ہمارے گھر سے باہر تھی.. قسطوں پر حاصل کردہ متعدد مکان تھے جو کرائے داروں سے حاصل کردہ رقم سے ہی آہستہ آہستہ میرے باپ کی ملکیت بن رہے تھے.. ان میں سے بیشتر کرائے دار بھی غیر قانونی ہوا کرتے تھے.. خوش حالی اس لیے گھر سے باہر تھی کہ میرا باپ ایک ایک چیز کا حساب رکھتا تھا یہاں تک کہ اُس دودھ کا حساب بھی رکھتا تھا جو میری ماں سونے سے پیشتر گرم کر کے مجھے پلاتی تھی.. وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ گوروں کی ملکہ اگر اپنے چھوٹے بیٹے کو بڑے بیٹے کی پرانی نیکریں پہنا سکتی ہے تو تم لوگ آسمان سے اُترے ہوئے ہو..

شادی کے صرف دو برس بعد میری بہن نے اپنے اجڈ خاوند کی روزانہ کی مارپیٹ سے تنگ آ کر اس سے طلاق حاصل کر لی اور ایک بار میں ویٹرلیس کے طور پر کام کرنے لگی.. میری ماں تو کئی روز تک بین کرتی رہی لیکن باپ کو کچھ قلق نہ ہوا.. وہ اُس لڑکے کے ماں باپ سے یہ وعدہ کر کے اُسے بریڈفورڈ لایا تھا کہ وہ اسے شہریت دلائے گا اور نوکری کا بندوبست کرے گا جو اُس نے کر دیا... اِس وعدے کے عوض جو رقم حاصل ہوئی تھی اُس سے اُس نے ایک اور مکان قسطوں پر خرید لیا تھا..

شاید میں اپنے باپ کا صرف منفی رُخ بیان کرتا چلا جا رہا ہوں..

وہ باقاعدگی سے نماز ادا کرتا تھا اور مقامی مسجد کی تعمیر میں اُس کا حصہ سب سے زیادہ تھا... میں اُس کا شکر گزار ہوں کہ اس نے ایک خاص عمر تک مجھے رہنے کے لیے جگہ اور خوراک مہیا کی.. تعلیم پر اُٹھنے والے اخراجات کے بارے میں اُس نے کبھی اعتراض نہ کیا.. مجھے کبھی مارا پیٹا بھی نہیں.. البتہ اس نے مجھے میری بہن سے ملنے سے منع کر دیا کہ اُس نے خاندان کا نام ڈبو دیا تھا اور ایک شراب خانے میں کام کرتی تھی..

وہ مجھے بھی بیئر پینے سے منع کرتا تھا.. شراب کو قطعی طور پر ہاتھ نہیں لگاتا تھا لیکن گوریوں سے ہم بستری اور مسلسل ہم بستری کو وہ عیسائیت پر اسلام کی برتری

کے کھاتے میں ڈال دیتا تھا.. اس نے ایک سٹور میں سے اپنا حصہ نکال لیا تھا جب اُسے معلوم ہوا تھا کہ اُس سٹور میں شراب اور سوّر کا گوشت بھی فروخت کیا جاتا ہے.. اُس کے اپنے اصول تھے.. یہ میری بدقسمتی تھی کہ میں برطانوی نظام تعلیم اور اس معاشرے کی بیشمار مثبت اقدار کا پروردہ تھا اور باپ کی شخصیت میں یہ تضاد مجھے ذاتی طور پر اذیت میں مبتلا رکھتا تھا.. میں نے کبھی اس سے بحث کرنے کی کوشش نہیں کی.. ایک تو شاید وہ مجھ پر ہاتھ اٹھا لیتا اور دوسرے یہ کہ اُس کی ذہنی استعداد اتنی نہ تھی کہ وہ یہ سمجھ سکے کہ اگر ٹکٹ چیکر نہ بھی موجود ہوں تو بھی آپ کو ٹکٹ خرید کر ٹرین میں سفر کرنا چاہیے کہ یہ آپ کی اخلاقی ذمہ داری ہے...

اے لیولز میں پانچ ایز حاصل کرنے پر مجھے لنڈن سکول آف اکنامکس میں داخلہ مل گیا اور میں بریڈ فورڈ چھوڑ کر لنڈن شفٹ کر گیا.. یہ پہلی بار تھا کہ مجھے لنڈن میں باقاعدہ قیام کرنے کا موقع ملا تھا.. اگرچہ میں بریڈ فورڈ میں بھی باقاعدگی سے مسجد جایا کرتا تھا اور سکول کے بعد وہاں سے میں نے ایک میرپوری مولوی صاحب سے قرآن پاک کی تعلیم بھی حاصل کی تھی.. لیکن میں کبھی بھی مذہب کی جانب راغب نہیں ہوا تھا.. جتنا مجھے میرا باپ دھکیلتا تھا بس اتنے ہی قدم اٹھاتا تھا.. جب کبھی کوئی عالم دین پاکستان سے آتا تو میرا باپ خاص طور پر مجھے اُس کا وعظ سننے کے لیے لے کر جاتا.. یہ مولوی حضرات لمبے لمبے چوغوں اور مزاحیہ قسم کی آڑی ترچھی ٹوپیوں میں ملبوس ہوتے اور ہمیں قبر کے عذاب اور قیامت کے قُرب کی نشانیاں بتلا کر میرپور میں تعمیر کی جانے والی کسی مسجد اور مدرسے کے لیے چندہ اکٹھا کر کے چلے جاتے.. میں اس کا اظہار نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ بے حد جاہل لوگ تھے جن کے پاس عذاب کی نوید کے سوا اور کچھ نہ تھا.. لیکن اس میں اُن کا کوئی قصور نہ تھا انہیں بریڈ فورڈ میں مدعو کرنے والوں کی ذہنی سطح بھی بس ایسی ہی تھی.. چنانچہ مذہب نے کبھی بھی مجھے اپنی



جانب متوجہ نہ کیا..

تو پھر میں یہاں کیسے آ گیا؟

لنڈن سکول آف اکنامکس کو ترک کر کے.. اپنے ماں باپ کو اطلاع کیے بغیر یہاں کیسے آ گیا اس تہہ خانے میں..

یقین کرو وہ اب بھی نہیں جانتے کہ ان کا بیٹا ہاشم میر کہاں غائب ہو گیا ہے.. میرا باپ یہ یقین رکھتا ہو گا کہ میں کسی گوری کے ساتھ شادی کر کے زندگی کے مزے لوٹ رہا ہوں اور اس کی سرزنش کے خوف سے روپوش ہو گیا ہوں..

سکول میں میرا ہم جماعت ایک سعودی لڑکا تھا.. ال منصور.. وہ بہت کم گو اور دھیما شخص تھا.. میل ملاقات کا شائق نہ تھا.. کلاسیں اٹینڈ کرنے کے بعد اپنے نوٹس فائل میں محفوظ کرنے کے بعد فوراً چلا جاتا.. ایک روز اسلامک سنٹر میں اُس سے ملاقات ہو گئی.. وہ نماز جمعہ کے لیے وہاں باقاعدگی سے آتا تھا لیکن اُس روز وہ صف میں میرے برابر میں کھڑا تھا اور جب اُس نے بائیں جانب سلام پھیر کر بلند آواز میں "السلام علیکم ورحمتہ اللہ" کہا تو میں نے بھی اتنی ہی بلند آواز میں جب دائیں جانب سلام پھیرا تو "السلام علیکم ورحمتہ اللہ" کہا اور میرے لبوں پر مسکراہٹ تھی..

خطبے کے بعد اُس نے مجھ سے پوچھا کہ تم مسکرائے کیوں تھے..

میں نے کہا' ہم اتنے دنوں سے ایک دوسرے کے ہم جماعت ہیں لیکن تم نے آج تک مجھے سلام کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی بلکہ امکان ہے کہ تم میرے وجود سے بھی آگاہ نہیں تھے تو آج تم نے جو اتنی بلند آواز میں سلام کہا تو.. میں اپنی مسکراہٹ پر قابو نہ رکھ سکا..

میں کیسے یہاں آیا؟

یہ ال منصور تھا جو مجھے یہاں لے کر آیا..

اُس نے مجھے اسلام کے اُس تصوّر سے آگاہ کیا جس کی وسعت.. کائناتی سچائی اور فراخدلی میرے گمان میں بھی نہ تھی.. جس کی رحمت اور محبت کے بارے میں مجھے آج تک کسی نے نہیں بتایا تھا.. میں اسے صرف خوف اور عذاب سمجھتا رہا تھا.. ایک ناقابل عمل عقیدہ سمجھتا رہا تھا.. وہ مجھے سامنے بٹھا کر قرآن پڑھتا اور پھر انگریزی میں اُس کی تفسیر کرتا تو مجھے ایسی دنیائیں دکھائی دینے لگتیں جو آج تک میری نظروں سے اوجھل تھیں اور میں اُن کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا..

مجھے اب تک جتنے بھی سعودی لڑکے ملے تھے وہ لاپروا اور کھلنڈرے لوگ تھے.. کند دماغ اور پیسے کی فراوانی کے تکبر میں مبتلا لوگ تھے... وہ ہم پاکستانی نژاد برطانویوں کو حقارت سے دیکھتے تھے لیکن ال منصور ایک ایسی نسل کا نمائندہ تھا جس نے پہلی بار غور کیا تھا.. پیٹروڈالر کے غرور میں سے باہر آکر اپنی عزت نفس کے بارے میں سوچا تھا.. وہ امریکیوں پر غلامانہ انحصار اور اُن کی سعودی عرب میں موجودگی کو اپنی عزت نفس کی توہین گردانتا تھا.. جس طرح میرے باپ کے کچھ اصول تھے اسی طرح ال منصور کا بھی ایک اپنا نکتۂ نظر تھا جس کے ساتھ اختلاف کیا جا سکتا ہے..

میں نے ابھی کہا ہے کہ یہ ال منصور تھا جو مجھے یہاں لے کر آیا.. ذاتی طور پر نہیں.. وہ تو شاید ابھی تک لنڈن میں زیر تعلیم ہے اور سوچتا ہے کہ وہ ہاشم میر جو سر جھکائے میری باتیں سنتا رہتا تھا یکدم کہاں چلا گیا ہے.. یہ اُس کی فکر تھی' جو مجھے یہاں لے آئی.. جس نے مجھے ایک مقصد دیا..

نہیں میں یہاں کفارہ ادا کرنے نہیں آیا.. اپنا فرض ادا کرنے کے لیے آیا ہوں.. بے مقصدیت کی.. اور بے وجہ زندگی کو ایک کائناتی تصوّر کے حصول کے لیے وقف کرنے کے لیے آیا ہوں.

مجھے یہاں پہنچ کر بہت سے دھچکے لگے..



مجھے محسوس ہوا کہ یہ وہ کائناتی تصوّر نہیں ہے جس کی مجھے خواہش تھی.. اس میں اتنی تنگ نظری۔ تعصّب اور جہالت ممکن ہی نہ تھی جو طالبان میں پر خلوص ہونے کے باوجود اُن کی محدود سوچ پر حکمرانی کرتی تھی.. اُن کی نیّت بے شک کھری تھی لیکن نیّت کرنے والے کی ذہنی سطح بھی تو اہم ہوتی ہے.. اگر برطانوی معاشرے کی اقدار مجھے اپنے باپ کی تعظیم کرنے سے روک سکتی تھیں تو میں طالبان کو بھی تو پرکھ سکتا تھا.. لیکن میں نے دیکھا کہ یہاں پرکھنے کی ہرگز اجازت نہیں ہے.. ایک جانب عورت اتنے بلند و برتر مقامِ فضیلت پر فائز کہ وہ ہمارے رسولؐ پر سب سے اوّل ایمان لاتی ہے.. اُسی سے اُن کی نسل آگے بڑھتی ہے اور دُوسری جانب اُسے ایک جانور بنا دیا جاتا ہے اور صرف اُس کے ٹخنے نظر آ جانے پر اسے سر بازار بید سے پیٹا جاتا ہے.. ایک فٹ بال سٹیڈیم میں ایک بڑے ہجوم کی موجودگی میں اُسے ایک باپردہ حالت میں.. برقعے میں لپیٹ کر شوٹ کیا جاتا ہے.. طالبان کو پرکھنے کے لیے اور بھی بہت کچھ تھا.. یہ میرا کائناتی تصوّر ہرگز نہ تھا.. میں بدزن ہو کر... بڑی آسانی سے سرحد پار کر کے اسلام آباد ایئرپورٹ سے لنڈن کی فلائٹ پر سوار ہو سکتا تھا کہ میرے پاس برٹش پاسپورٹ ہے لیکن میں نے ایسا نہیں کیا.. کیونکہ میں تم جیسے حوصلہ مند اور اپنے مقصد پر مکمل یقین رکھنے والے ساتھیوں کو نہیں چھوڑ سکتا تھا...

اب میں طالبان کے لیے نہیں. تصوّر کامل کے حصول کے لیے نہیں...

اپنے بے لوث اور جاں نثار ہمراہیوں کی خاطر یہاں ہوں..

کس نے پوچھا تھا کہ میں یہاں کیوں ہوں؟..

"میں نے.." مرتضٰی بیگ کی آواز آئی "لیکن میں نے وہ سب کچھ نہیں سنا جو تم کہہ رہے تھے.. میں.. گھوڑے کے گوشت کی اپنے معدے میں تقویت کے باوجود اپنی نقاہت میں کچھ دیر کے لیے اُونگھ گیا تھا.. جانے تم کیا کہہ رہے

تھے.. جنوں میں جو کچھ کہا جاتا ہے وہ سمجھ میں نہیں آتا.. میں نے صرف یہ سنا کہ بریڈ فورڈ میں تمہارا ایک باپ تھا.. ایک ماں تھی جو سونے سے پیشتر تمہیں گرم دودھ پلاتی تھی.. کوئی ال منصور تھا.. اور طالبان تھے جن کی نیت کھری تھی لیکن وہ ایک عورت کے ٹخنے بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے.. لیکن ہاشم میر.. جو ہوا سو ہوا.. اب اس تہہ خانے میں بھوک سے مجبور ہو کر ایک مردہ گھوڑے کے گوشت کو نگلنے کی کوشش کرتے ہوئے.. شدید سردی میں ٹھٹھرتے.. گھوڑے کی سرد لید اور منجمد پیشاب میں لتھڑے ہوئے.. جب کہ تم جانتے ہو کہ ہم کبھی بھی اس قبر میں سے زندہ نہیں نکل سکیں گے.. ہم یہاں صرف مرنے کے لیے موجود ہیں تو کیا پھر بھی.. اپنے برطانوی نظام تعلیم اور معاشرے کی اقدار کو مدنظر رکھتے ہوئے جن کا تم بار بار حوالہ دیتے ہو.. کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہارا... یہاں آنے کا فیصلہ درست تھا؟"

"بے شک.." ہاشم کی نقاہت بھری آواز میں توانائی در آئی "بے شک.."

"اور تمہیں کوئی پچھتاوا نہیں؟"

"نہیں.."

یہ جانی تھا جس نے ایک ناتواں کروٹ لی.. وہ ہاشم میر کی کہی ہوئی داستان سے بے خبر تھا.. اُس کے اندر تو گھوڑے کے گوشت کی توانائی بھی نہ تھی اس لیے وہ سب سے بے خبر تھا لیکن اُس نے صرف اتنا سنا کہ کوئی پوچھ رہا ہے کہ تمہارا یہاں آنے کا فیصلہ درست کیا.. اور کوئی اور جواب دے رہا ہے کہ بے شک.. تو اُس نے کسی کو بھی مخاطب نہ کیا.. تاریکی کو گھورتا ہوا بولا "بے شک.. مجھے بھی شامل کر لو.. مجھے بھی کوئی قلق نہیں.. میں آرلنگٹن کے امریکی ہیروز کے خصوصی قبرستان میں دفن ہو کر اپنی قبر پر ایک دائمی شعلہ روشن کروانے کی بجائے یہاں قلعہ جنگی کے اس تہہ خانے میں مر جانا بخوشی پسند کروں گا.. بے شک.."



"لیکن تم.. گھوڑا نہیں کھاؤ گے؟"

"نہیں.. بے شک نہیں"

"مر جاؤ گے.. لیکن نہیں کھاؤ گے؟"

"نہیں.."

"کیا تم میں کچھ عقل نہیں ہے جانی؟"

"عقل کا عمر سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا بیگ.. محض اس لیے کہ تم ہم سے چند برس پہلے پیدا ہوئے تھے تم ہمارے لیے فیصلے نہیں کر سکتے.."

"میں تمہارے لیے کوئی فیصلہ نہیں کر رہا جانی.. یہ میری مشرقیت ہے جو عمر میں بڑا ہونے کے باعث تمہاری ذمہ داری میرے کاندھوں پر ڈالتی ہے.. تم سب مجھے بے حد پیارے ہو میرے روحانی رشتے دار ہو.. میں صرف اس آرزو میں ہوں کہ تمہارے معدے کے اندر کچھ خوراک جائے، تمہیں کچھ تقویت دے اتنی کہ جب وہ آئیں تو تم کم از کم اُن کا کچھ تو مقابلہ کر سکو"

"وہ تو نہیں آئیں گے بیگ.. میرے ہم وطن نہیں آئیں گے اور تم سب اس خوش فہمی کا شکار تھے کہ وہ آئیں گے.. تمہارے رُوبرو ہوں گے اور تمہارے ایمان کا زور اُن پر حاوی ہو جائے گا.. لیکن وہ تو اُوپر آسمانوں میں ہی رہے.."

"شمال والے تو زمین پر ہیں.."

"آہو.. وہ اپنی زمین پر ہیں اور ہم اپنی زمین چھوڑ آئے ہیں.." بہت دیر سے اللہ بخش کچھ نہیں بولا تھا.. اب بولا "شمال والے اُوپر قلعہ جنگی کے صحن میں لاشوں کی تلاشی لیتے رہیں گے پھر ادھر کیا کرنا ہے انہوں نے آکر.. نہ وہ جانتے ہیں کہ ہم ادھر ہیں.. وہ تو موج کر رہے ہیں اپنے مزار شریف میں"

"صرف ایک پارچہ نگل لو جانی.. پلیز.." بیگ ہمت نہیں ہار رہا تھا

"صرف ایک چھوٹا سا ٹکڑا.. تم صرف اسے منہ میں رکھ لو اور میں تمہارے منہ پر

اپنی ہتھیلی جمادوں گا اور وہ باہر نہیں آئے گا.. پلیز"

"نہیں.."

"جانی... ایک تصور کامل کی خاطر تم نے بہت کچھ تیاگ دیا ہے.. تھوڑی سی قربانی اور دے دو.."

"جانی.."

جانی کی جانب سے "نہیں" بھی نہ آیا.. وہ ایک مرگ کیفیت اونگھ میں جا چکا تھا اور اُس کے ساتھ اب گفتگو کرنا ممکن نہ رہا تھا..

"نہیں نہیں.." اللہ بخش کا سر اُس کے نیم مردہ دھڑ سے الگ یوں حرکت میں آیا جیسے اُسے بیٹری سیل کے ساتھ متحرک کر دیا گیا ہو "نہیں.. نہیں"

"اللہ بخش.. یہ تم ہو.."

"ہو.."

اُس کا متحرک منہ کچے فرش میں سے دُھول اڑاتا کھلا اور "ہو ہو" کرنے لگا.. اُسے جب کبھی مخاطب کیا جاتا تو وہ ہمیشہ منہ کھول کر "ہو" کہتا اور ایک ننھی سی رال ٹپک جاتی..

"تم.. نہیں نہیں.. کیوں کہہ رہے تھے؟"

"اس لیے کہ میں بھی.. نہیں نہیں.. ہوں.. آہو.. بیگ جی میں نے تم سب سے زیادہ آسانی کے ساتھ گھوڑے کو کھایا ہے.. آسانی سے گھوڑا میں نے اس لیے کھایا ہے کہ میں تم سب سے زیادہ بھوکا ہوں.. تم سب رجّے پُجّے لوگ ہو کھاتے پیتے گھروں کے.. تم تو صرف پچھلے چار پانچ دن سے بھوکے ہو اور میں ہمیشہ سے بھوکا ہوں اس لیے میں نے گھوڑا آسانی سے کھایا ہے آہو.. مجھے آج تک کسی نے نہیں پوچھا کہ اللہ بخش اگر تم ہو تو کیوں ہو کیونکہ میں کمّی کمین ہوں.. اور تم نے بھی نہیں پوچھا بیگ بھائی.."



"کیا مطلب؟"

"تم نے اپنا آپ بتایا ہے کہ تم یہاں کیسے آگئے.. چی چی اور ہاشم نے بتایا ہے.. سب سے پوچھا ہے پر مجھ سے نہیں پوچھا کہ میں یہاں کیسے آگیا؟"

بیگ کے ہونٹ پھٹے ہوئے تھے اور ذرا سا سکیڑنے سے بہت دُکھتے تھے اس کے باوجود وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکا "چلو میں تم سے بھی پوچھ لیتا ہوں.. اللہ بخش تم یہاں کیسے آگئے؟"

"مجھے ایک بونے نے یہاں بھیجا ہے.." اللہ بخش کی آواز میں فخر تھا..

"بونے نے؟" اور بیگ کی آواز میں حیرت تھی..

"آہو.. بونے نہیں ہوتے.. بالشت بھر کے بندے.."

"میرا خیال ہے گھوڑے کا گوشت تمہیں موافق نہیں آرہا.. تم آرام کرو"

"تم سمجھتے ہو میں جھلّا ہوں.. میں قسم ایمان کی سچ کہتا ہوں مجھے یہاں ایک بونے نے بھیجا ہے.."

"چلو بتاؤ کہ کس طرح بھیجا ہے.."

"پہلے سب کو.. چی چی وہاب اور گورے کو بتاؤ کہ مجھے بونے نے بھیجا ہے پھر سناؤں گا کہ کس طرح بھیجا ہے.."

"اگر وہ سن سکتے ہیں تو سن لیں گے... وہ بہت دیر سے کچھ نہیں بولے.. جانی کے معدے میں کچھ نہیں گیا اُس نے کیا سننا ہے تم مجھے سناؤ.."

"بیگ.." یہ جانی تھا "آئی ایم ناٹ ڈیڈ ایز ییٹ.. سناؤ اللہ بخش.. مجھے بونے کی کہانی سناؤ.. یُو مین ڈوارف؟"

"ہاں جانی.." بیگ خوش ہوا کہ وہ ہوش میں ہے "بونا... ڈوارف.." اللہ بخش اتنا جذباتی ہوا کہ کراہتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا..

فرش پر گھوڑے کی لید سخت ہو چکی تھی سرد بہت تھی..

سیڑھیاں تاریک تھیں..

باہر پھر رات کا راج تھا..

"میرے داد کے اور نانکے دونوں آبائی میراثی پیشہ تھے یعنی جس کو مولوی صاحب نجیب الطرفین کہتے ہیں.. ہمارا کام چوہدریوں کے حقے بھرنا، جگتیں کر کے اُن کا دل لگانا.. ہاسا مخول کرنا تھا اور جھولی پھیلائے رکھنا تھا.. اُس جھولی میں اگر وہ کچھ ڈال دیتے تو ہماری موج ہو جاتی ورنہ بھوکے بھی سو رہتے.. کنک کی کٹائی کے دن آتے تو ہم اُن کے کامے ہو جاتے.. کھیتوں میں گرے پڑے سٹے جمع کر کے اُن میں سے دانے نکال کر انہیں اُبال لیتے اور گُڑ کے ساتھ کھا لیتے... جگتیں کرنے اور ہاسے مخول کے سوا ہمیں اور کچھ آتا ہی نہ تھا.. البتہ جو ڈھولکی کھڑکا لیتے تھے وہ شہر جا کر میوزیشن ہو گئے اور ایک دو نے سٹیج پر چڑھ کر بڑی مشہوری کمائی.. دولت کمائی پر وہ اپنے آپ کو میراثی نہیں کہتے تھے آرٹسٹ کہتے تھے اور ہمارے ساتھ سلام دعا نہیں کرتے تھے۔ باقی سب گاؤں میں ویسے ہی کمّی کمین رہے جھولی پھیلائے چوہدریوں کی آل اولاد کی خیریں مانگتے رہے.... اور.."

"اللہ بخش.." جانی پھر اونگھنے کو تھا "تم بونوں کی بات کرو"

"آہو.. وہ بھی بتاتا ہوں.. پر پہلے میں تمہیں ایک عجیب معلومات دیتا



ہوں... بڑی خاص معلومات ہے.. ادھر ہمارے پاس جتنے بھی ذرا سخت طبیعت والے مولوی اور مدرسوں کے طالب علم ہیں اُن میں بڑی تعداد میرے جیسے کمّی کمینوں کی ہے.. پوچھو کیوں؟.. ایک تو یہ اُدھر روٹی پانی کا بندوبست ہو جاتا ہے.. سب لوگ برابر ہوتے ہیں کیونکہ میرے سوہنے رسولؐ نے اعلان فرمایا تھا کہ رنگ نسل اور قبیلہ برادری کچھ نہیں سب برابر ہیں.. دوسرا یہ کہ کمی کمین جب داڑھیاں رکھ کر مولوی ہو جاتے تھے اور ہاتھ میں کلاشنکوف پکڑ لیتے تھے تو اُن کے سامنے کوئی چوں نہیں کر سکتا تھا کہ وہ تو اللہ کے سپاہی ہوتے تھے.. ذرا سوچو قیاس کرو کہ ایک کمّی جو چوہدری کے آگے کُسک نہیں سکتا تھا.. جب مولوی ہو جاتا تھا تو چوہدری کیا کوئی بھی اُس کے آگے کُسک نہیں سکتا تھا.. سمجھ لو کہ ایسے وہ بدلہ لیتے تھے اُن سے جو انہیں کمتر جانتے تھے.. ہے ناں عجیب معلومات.. آہو!

"اوئے سن رہے ہو؟"

کوئی بھی نہیں سن رہا تھا..

یہاں تک کہ بیگ بھی نڈھال حالت میں تاریکی میں گم کہیں تھا..

چی چی۔ وہاب۔ ہاشم۔ گل شیر۔ جانی.. سب کے سب نقاہت سے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے تہہ خانے کے فرش پر بکھرے ہوئے تھے.. نیم مردہ تھے..

کوئی بھی نہیں سن رہا تھا..

"اوئے سن رہے ہو؟" اللہ بخش نے غصے سے پکارا..

اوپر قلعہ جنگی کے صحن کی رات سرد تر ہو رہی تھی اور لاشیں اُس کی یخ بستگی سے اپنے آپ ہی سکڑ رہی تھیں... شیر محمد کو ہمیشہ سے سردی زیادہ لگتی تھی اور وہ سردیوں کی راتوں میں تازہ دُھنکی ہوئی روئی کے چھینٹ والے پُھولے ہوئے گرم لحاف میں بھی ٹانگیں پیٹ سے لگائے سکڑتا رہتا تھا.. اُس کی لاش اسی لیے بقیہ سینکڑوں لاشوں کی نسبت زیادہ سکڑ رہی تھی..

"نہیں سن رہے؟ میں نے تمہاری سنی ہے اور میری باری آئی ہے تو مچل مار کر سوگئے ہو.." اللہ بخش اپنے اردگرد کے اندھیرے سے مخاطب ہو کر خود کلامی میں مصروف ہو گیا "بونوں کی بات ابھی باقی ہے اور تم سوگئے ہو.. ایک دفعہ ناں میں جمعہ پڑھنے کے لیے مسجد میں گیا تو وہاں ایک افغانی آیا ہوا تھا.. مولوی صاحب کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں اور اُن کے آنسو داڑھی پر گرتے تھے اور انہوں نے ہمیں بتایا کہ یہ مجاہد ہے اور اللہ تعالیٰ کا خاص بندہ ہے بہت دُور سے آیا ہے اس کا وعظ سنو.. اس افغانی نے بڑے دردناک قصے سنائے.. کافروں کے ظلم کی داستانیں سنائیں.. اللہ رسولؐ کے واسطے دیئے' شہادت کا مرتبہ بیان کیا اور کہا کہ اسلام کی مدد کے لیے چندہ دو.. جتنے بھی نمازی تھے اُن کے پاس جو کچھ تھا انہوں نے افغانی کی جھولی میں ڈال دیا اور سبھی آہ وزاری کر رہے تھے.. اُس نے نوٹ اکٹھے کیے اور اگلے گاؤں چلا گیا.. سو جی مجھ پر بھی بڑا اثر ہوا.."

"پاکستانی..." ایک نہایت لاغر سی آواز جانی کی جانب سے آئی "پاکستانی میں تمہارا نام بھول گیا ہوں.... بونے ابھی تک نہیں آئے.. قصہ ختم کرو"

"ابھی آتے ہیں امریکی بھائی.." اللہ بخش خوش ہو گیا کہ کوئی نہ کوئی تو اُس کی کہانی سن رہا ہے "ہمارے علاقے میں ٹیوب ویل کا رواج زیادہ نہیں.. مہنگا پڑتا ہے.. ابھی تک کنوئیں کھود کر کام چلاتے ہیں.. تو ہمارے ایک چوہدری قائم دین کے بیٹے نے دوبئی جا کر لمبی رقمیں بھیجیں تو اُس نے سوچا کہ ان کی جو کلراٹھی زمین بے آباد پڑی ہے اُس میں ایک نیا کنواں کھدوالے.. کنواں کھودنے کے لیے نُور کوٹ کے کاریگر بڑے مشہور تھے.. ان کو چوہدری نے بلایا.. یہ بڑے کمال کے لوگ ہوتے ہیں کنواں کھودنے والے.. آہو.. بڑا حساب کتاب کرتے ہیں۔ ناپ تول کرتے ہیں۔ لمبائی چوڑائی ماپتے ہیں.. مٹی کو سونگھ کر بتاتے ہیں کہ یہاں کنواں کھودو تو پانی کناروں تک آجائے گا.... پہلے زمین پر کنوئیں کا گول



مہاندرہ اُلیکتے ہیں اور پھر اُس پر گولائی میں اینٹیں جماتے ہیں اور ایسا حساب کتاب لگاتے ہیں کہ مٹی کے کھودنے کے ساتھ ساتھ وہ اینٹیں زمین میں دھنستی چلی جاتی ہیں.."

"پاکستانی.. مجھے لگتا ہے کہ بونے کبھی نہیں آئیں گے..."

"بس آرہے ہیں.." اللہ بخش بے تکان بول رہا تھا "تو جناب جس روز کنواں تیار ہو جاتا ہے.. پورے کا پورا پکا اینٹوں کا گول مہاندرہ زمین کے اندر چلا جاتا ہے اور اس کے درمیان میں سے پانی نکلنے کا دن آتا ہے تو وہاں میلہ لگ جاتا ہے.. میٹھے چاولوں کی دیگیں چڑھ جاتی ہیں.. چھوٹے بڑے سب اُس کے کناروں پر بیٹھ کر کنوئیں کے اندر جھانکتے ہیں کہ اب پانی نکلا کہ نکلا.. لیکن بچّوں کو سب سے زیادہ انتظار ہوتا ہے کیونکہ کہا جاتا ہے کہ جونہی زمین کی تہہ میں سے پانی پھوٹتا ہے اُس کے ساتھ ہی زمین کے اندر رہنے والے بونے بے آرام ہو کر باہر آتے ہیں اور کنوئیں کی دیواروں سے چڑھ کر منڈیر پر کود کر اُچھلتے ہوئے آس پاس کے کھیتوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوتا ہے کہ وہ نظر ہی نہیں آتے.. آپ آنکھ جھپکو تو اس دوران وہ نیچے سے اُوپر آکر منڈیر سے کود کر غائب ہو جاتے ہیں... اس لیے کنوئیں میں جھانکنے والا ہر بچّہ کوشش کرتا ہے کہ اُس لمحے آنکھ نہ جھپکے اور انہیں دیکھ لے.."

"بونے سب کو نظر نہیں آتے؟"

"کون ہے؟" اللہ بخش نے گھبرا کر آس پاس گھورا.. یہ جانی نہ تھا کوئی اور تھا..

"میں ہوں اللہ بخش.. ہاشم میر.. مجھے یاد آرہا ہے کہ میرا باپ بھی مجھے اسی قسم کی کوئی کہانی سنایا کرتا تھا جس میں بونے ہوتے تھے.."

"تم سن رہے تھے؟"

"نہیں.. میں تو غنودگی میں گم تھا.. اور مجھے ایسا لگا جیسے بہت سے بونے میرے اردگرد ناچ رہے ہیں اور میں زمین پر گرا پڑا ہوں اور وہ فتح کا جشن منا رہے ہیں اور مجھے رسیّوں سے باندھنے کی کوشش کر رہے ہیں.. میں ان رسیّوں کی گرفت کھول کر آزاد ہونا چاہتا ہوں اور اُس کمرے میں جانا چاہتا ہوں جہاں ایک گیس ہیٹر کی گرمائش میری منتظر ہے اور میری ماں گرم دودھ کا گلاس تھامے کھڑی ہے.. میں اُس غنودگی سے لمحہ بھر کے لیے باہر آیا ہوں تو تم بونوں کی باتیں کر رہے تھے.."

"بس وہ بونا آنے والا ہے جو مجھے یہاں تک لے آیا.."

"میں بھی اُسی کے انتظار میں ہوں.." جانی کی مدھم منتظر آواز آئی..

اللہ بخش کی مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا.. ہاشم اور جانی اُسے سن رہے تھے..

"آہو.. بونے سب کو نظر نہیں آتے.. صرف اُن بچّوں کو کبھی کبھار نظر آجاتے ہیں جو آنکھیں نہیں جھپکتے.. تو میں بھی منڈیر پر بیٹھا کوشش کرتا تھا کہ کنویں کی تہہ پر نظر رکھوں اور آنکھیں نہ جھپکوں اگرچہ میں بچّہ نہ تھا.. جب.. تہہ کے کیچڑ میں سے ایک بونا نکلا.. اور اینٹوں میں اپنے پنجے گاڑتا ایک بندر کی طرح میرے برابر میں منڈیر پر آنکلا.. آہو.. قسم ایمان کی سچ کہتا ہوں.. اُس کی شکل عجیب سی تھی۔ تھا تو انسان پر لگتا نہیں تھا.. میری اُنگلی سے بھی چھوٹا ہوگا پر اُس کی داڑھی میرے ہاتھ جتنی لمبی تھی' کیچڑ میں لت پت.. جسے وہ اپنی چھوٹی چھوٹی مٹھیوں میں بھینچ کر نچوڑتا تھا.. آنکھیں گول گول تھیں بنٹوں کی طرح.. اور ہاں بالکل ننگا تھا... ننگ پننگا... اور جب وہ بولا ہے تو اُسی افغانی بابے کی آواز میں جو مسجد میں چندہ مانگنے آیا تھا.. اور اس نے بھی وہی دردناک قصے سنائے۔ کافروں کے ظلم کی داستانیں سنائیں۔ شہادت کا مرتبہ بیان کیا اور کہنے لگا تم جہاد



کرو اور اسلام پر قربان ہو جاؤ.. میں ڈرا ہوا تو بہت تھا پر میں نے ہمت کرکے پوچھا.. پر کیسے قربان ہو جاؤں... کہنے لگا' فوراً اکوڑہ خٹک پہنچو وہاں تمہارا انتظار ہو رہا ہے.. فوراً پہنچو.. لو جی اُس نے یہ کہا اور منڈیر سے اُچھل کر کماد کے کھیت میں گم ہو گیا.. میں اُس کے پیچھے گیا' بہتیرا تلاش کیا کہ اُس سے یہ پوچھ لوں کہ یہ اکوڑہ خٹک ہے کدھر.. پر جناب ایک انگلی جتنا بندہ کماد کے کھیت میں مل سکتا ہے.. وہاں تو ایک زنانی اور ایک بندہ گھس جائیں تو نہیں ملتے وہ کہاں ملتا.. سُن رہے ہو؟"

کوئی جواب نہ آیا..

تہہ خانے میں جتنا اندھیرا تھا اُس سے بڑھ کر خاموشی تھی.. کسی کے کراہنے کی آواز بھی نہ تھی..

"بس تھوڑی سی کہانی رہ گئی ہے.. کوئی سُن نہیں رہا تو میں کہانی ادھوری تو نہیں چھوڑ سکتا.. تو میں نے بعد میں کچھ لوگوں سے پوچھا تو وہ کہنے لگے کہ کوئی بونے شونے نہیں ہوتے.. ایسے ہی بچّوں کو بہلانے کے لیے یہ مشہوری ہو گئی ہے.. میں نے اُنہیں داڑھی والے بونے کے بارے میں بتایا تو وہ ہنسنے لگے کہ ہوناں میراثی.. مسخریاں کرتے ہو.. ہم نے تو کوئی بونا نہیں دیکھا یہ تمہارے خیال ہی خیال میں ہے سچ مچ نہیں ہے.. پر میں دین ایمان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ بونا تھا.. تو جناب عالی میں کسی کو بتائے بغیر گھر سے نکلا اور کسی نہ کسی طرح اکوڑہ خٹک پہنچ گیا.. اور وہاں کے مدرسے میں بھرتی ہو گیا.. بڑی موج تھی.. حیاتی میں پہلی بار تین وقت کی روٹی ملی.. تین کپڑے اور چپل ملی.. سونے کو چارپائی ملی.. اور ساتھ مفت میں دینی تعلیم بھی.. میرے ساتھ جتنے طالبان تھے ان میں سے بیشتر مجھ ایسے ہی تھے.. پتہ نہیں اُنہیں بھی بونے نے ہی ادھر بھیجا تھا.. شہروں کے لڑکے بھی تھے جو اتنے غریب غربا تھے کہ سکولوں کی فیسیں نہیں دے سکتے تھے

پر پڑھنے کا شوق تھا.... یہاں تعلیم بھی ملتی تھی.. کتابیں بھی ملتی تھیں اور سب سے بڑھ کر عزت بھی ملتی تھی ورنہ شہر میں تو وہ بے عزت ہی رہتے تھے.. گاؤں کا فائدہ یہ ہے کہ وہاں اگر آپ کمین ذات کے ہو تو صرف اپنے چوہدریوں کے ہو جو تمہارا خیال بھی رکھتے ہیں.. شہر میں تو ایسے غریب مسکین پورے شہر کے کمین ہوتے ہیں اور کوئی بھی اُن کا خیال نہیں رکھتا... تو اس مدرسے میں بڑی موج تھی.. اب اگر وہ موج کراتے ہیں تو یہ بھی تو کہہ سکتے ہیں کہ اُٹھ اللہ بخش افغانستان جا اور جہاد کر.. ویسے ہمارے جو بڑے مولوی صاحب تھے بڑے امیر کبیر تھے.. ہوائی جہازوں جیسی تو اُن کے پاس درجنوں کاریں تھیں.. مدرسے سے نکلتے تھے تو درجنوں ہتھیار بند مرید آس پاس ہوتے تھے.. سنا تھا کہ انہیں عرب ملکوں سے بڑی رقم امداد میں ملتی ہے... پر خدا کو جان دینی ہے وہ ہم پر بھی بڑا خرچ کرتے تھے اور عزت دیتے تھے.. بڑے مولوی صاحب کی بڑی مشہوریاں تھیں..

اسلام آباد میں بڑا اثر و رسوخ تھا اور حکومت والے بھی اُن سے ڈرتے تھے.. پر دُوسرے مدرسوں والے طالبان ہمیں بڑا چھیڑتے تھے کہ تمہارا مولوی سینڈوچ ہے.. اللہ معاف کرے جہنمی کہتے تھے کہ نیچے کوئی اور اُوپر کوئی اور.. پتہ نہیں مجھے تو سمجھ نہیں آتی کہ یہ کیا بہتان ہے.. پر بھائی مجھے کیا.. مجھے تو حیاتی میں پہلی بار تین کپڑے اور تین وقت کا کھانا ملا تھا.. اور کوئی مجھے بخشو میراثی نہیں کہتا تھا حضرت اللہ بخش کہتے تھے.. ہاں مجھے کیا.. مجھے تو ایک بونے نے وہاں بھیجا تھا.. سچ کہتا ہوں یہ بونا خیال ہی خیال میں نہیں آیا تھا سچ مچ کنویں کی منڈیر پر بیٹھا مجھ سے باتیں کرتا تھا.. آہو!.. تو میں ایسے یہاں پہنچ گیا.. سن رہے ہو؟.. اوئے مر گئے ہو؟"



جیسے بونے نظر نہیں آتے ایسے وہ طیارے بھی نظر نہیں آتے تھے.. آتے تھے اور اپنا ہلاکت خیز بوجھ گرا کر چلے جاتے تھے..

ان طیاروں میں نصب شدہ کیمروں کی متحرک تصویروں میں نیچے زمین ایسے نظر آتی ہے جیسے خمیر شدہ آٹا...

ہزاروں برس پرانی ایک مقدّس کتاب میں بھی یہی درج ہے کہ اُوپر.. جب انسان بہت بلندی پر چلا جائے تو وہاں سے زمین ایسے نظر آتی ہے جیسے خمیر شدہ آٹا حالانکہ اس زمانے میں سیٹلائٹ ایجاد نہیں ہوئے تھے..

تو جب اُن طیاروں میں نصب کیمروں کی متحرک تصویریں ٹیلی ویژن سکرین پر ایک احساس تکبر کے ساتھ دکھائی جاتی ہیں اور خمیر شدہ آٹا جو کہ زمین ہوتی ہے اُس پر زوم اِن کرتے چلے جاتے ہیں تو جو دھبے اور بلبلے سے دکھائی دے رہے ہوتے ہیں وہ واضح ہونے لگتے ہیں.. قریب سے قریب تر ہوتے چلے جاتے ہیں تو گاؤں۔ آبادیاں۔ بستیاں اور کھیت اپنی شکل ظاہر کرنے لگتے ہیں یہاں تک کہ آپ قربت.. تکنیکی مہارت کی قریب ترین قربت تک پہنچتے ہیں تو اُن آبادیوں کے گھر اور مکین بھی دکھائی دینے لگتے ہیں.. اور تب آپ اپنا پہلا ڈیزی کٹر ریلیز کرتے ہیں... چونکہ یہ ایک منی ایٹم بم بھی کہلاتا ہے اس لیے اس کا وزن بہت ہوتا ہے اور یہ وہاں تک پہنچنے میں دیر نہیں لگاتا... اور تب کیمرے کی

متحرک تصویر میں ایک ہلکا سا شعلہ بھڑکتا ہے جسے دیکھ کر اُسے ریلیز کرنے والا ہاتھ ایک بے اختیار مسرت میں اُٹھتا ہے اور انگلیوں سے "وی" کا نشان بنا کر اطمینان قلب کا اظہار کرتا ہے "آئی گاٹ دی باسٹرڈز" اور طیارے کو واپسی کی پوزیشن میں لے جاتا ہے..

وہ صرف اُس شعلے کو اُٹھتے ہوئے دیکھ کر لوٹ جاتا ہے.. حالانکہ اصل تماشہ تو بعد میں شروع ہوتا ہے.. سب کچھ بھسم ہونے لگتا ہے.. قریبی ٹیلے اور پہاڑیاں ملیامیٹ ہو کر بستی کو دفن کرنے لگتے ہیں.. بستی کے گھر اور گھروں کے اندر جو کچھ عام طور پر ہوتا ہے.. یعنی بچے۔ اُن کے کھلونے۔ بوڑھے۔ اُن کی دستاریں اور لاٹھیاں.. عورتیں۔ اُن کے چولہے اور سنگھار وہ سب کے سب اس شعلے کی زد میں آکر اسے مزید بھڑکانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں کیونکہ انسانی بدن کی چربی خوب ہی جلتی اور بھڑکتی ہے.. "آئی گاٹ دی باسٹرڈز"

ڈیزی کٹر ایک تہذیب یافتہ بم ہے.. اور نیپام کی مانند صرف جلاتا نہیں باسٹرڈز کی چربی کو بھی ضائع نہیں کرتا اور اُس سے شعلے تخلیق کرتا ہے..

اس کے سینکڑوں چھوٹے چھوٹے زرد بچے بھی ہوتے ہیں جو بعد میں بھی انسانی بچوں کی جانوں سے کھیلتے رہتے ہیں..

ایک اور کیمرے کی تصویر میں اُوپر آسمانوں میں محفوظ آنکھ ایک کچی فصیل میں گھرے قلعہ جنگی کو دیکھتی ہے اور کہتی ہے "تم جہاں یہ سفیدی اور عمارتیں دیکھ رہے ہو اس کے صحن میں ہی کہیں وہ باسٹرڈز ہیں.. ان پر اپنا بوجھ گرا دو....."

نیچے قلعہ جنگی کے کچے صحن میں وہ باسٹرڈز بغاوت کر رہے تھے جن میں سے بیشتر کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے لیکن کیمرہ اتنا کلوز نہیں جاتا..

وہ طیارے اپنے مدار پر گھومتے اپنا فرض ادا کر کے واپس چلے گئے تھے..



مگر وہ دوبارہ ادھر آتے اور اُن کے کیمرے ایک اور کلوز اپ اُتارتے تو اُس میں وہ سینکڑوں باسٹرڈز نظر نہ آتے.. وہ ڈھول میں بچھے ہوئے.. ریزہ ریزہ ہو چکے ہوتے کیسے نظر آتے.. اتنی بلندی سے بہتا ہوا خون تو بالکل ہی نظر نہیں آتا.. نہ ہی رزقِ خاک ہونے والے نظر آتے..

یہ ایک بے مثال ٹارگٹ پریکٹس تھی..

البتہ ابھی کچھ ایسے باسٹرڈز باقی تھے جو اُس قلعے کے تہہ خانے کی تاریکی میں ایک مردہ گھوڑے کے نیچے.. کاٹے ہوئے ڈھانچے کے آس پاس پڑے تھے.. چونکہ وہ تہہ خانے میں تھے اس لیے کیمرہ اُن کی متحرک تصویر بنانے سے قاصر تھا.. نہ ہی یہ پتہ چل سکتا تھا کہ نیچے ایک مکر چاندنی ہے.. دھوپ ہے یا شب کی سیاہی ہے..

اگر اُس کیمرے میں ذرّہ بھر بھی رومانیت کا عنصر ہوتا تو وہ یقیناً قلعہ جنگی کے صحن پر اُتری ہوئی مکر چاندنی کی ایک رومان پرور تصویر اُتار لیتا. لیکن زیادہ کلوز نہیں کیونکہ اس طرح اُس رومان میں لاشیں اکڑنے لگتیں..

اور اگر اُس آسمانی کیمرے میں حسِ شعر کا کوئی کل پرزہ فٹ ہوتا تو وہ قلعہ جنگی سے کچھ فاصلے پر بلخ کے کھنڈروں کو فوکس میں لا کر مثنوی مولانا روم کی آہٹ سن لیتا.. اُس بلخ کو فوکس کرنے میں بے حد آسانی ہوتی کیونکہ وہاں ابھی تک ایک آتش پرست اپنے شعلے کو بجھنے نہ دیتا تھا.. کیمرے کو فوکس کرنے کے لیے ایسی روشنی معاون ثابت ہوتی ہے..

آتش پرست کو خوش ہونا چاہیے تھا کہ صرف بلخ کے کھنڈروں میں ہی نہیں ہر جگہ ہر مقام پر انسانی چربی کے الاؤ روشن ہو رہے تھے..

گھوڑے کا ڈھانچہ اب بُو دینے لگا تھا..

اُن سب کے نیم مردہ ڈھانچے بھی ایسے ہو چکے تھے کہ اُن میں سے بھی

بو اُٹھ رہی تھی.. لیکن ان کی.. گھوڑے کی.. اور اُن سب کی بُو صرف وہی سونگھ سکتے تھے..

لیکن وہ نہیں سونگھ سکتے تھے..

بے شک بلخ کا آتش پرست ایک ہمسایہ ہو.. مزار شریف قریب ہو.. جہاں جشن کی رات ہو.. تب بھی قلعہ جنگی کے کچے صحن میں.. بے شک چاندنی ہو.. جتنی بھی لاشیں تھیں ان کی قے آور مردہ بُو سے الگ اُن کی ابھی تک زندہ بُو تھی.. گھوڑے کی.. اور ان سب کی..

بامیان وہاں سے بہت دور نہ تھا..

لیکن وہاں تک اُن کی بُو نہ جاتی تھی..

اگر جاتی تو بدھ کے چٹان قامت مجسموں کے نتھنوں میں جاتی تو مہاتما کے پتھریلے لبادے بھی اُسے برداشت نہ کر سکتے اور وہ خود بخود مسمار ہو جاتے..

ویسے اب کوئی فائدہ نہ تھا.. بُو کے جانے کا..

جہاں بدھ کے مجسمے تھے وہاں اب ایک عظیم چٹانی خلا تھا..

اگر جاتی تو اُس خلا کو ماتم کناں پا کر پھر سے قلعہ جنگی کو لوٹ آتی..

جھیل بندِ امیر میں جتنے بھی نیلگوں پانی تھے وہ اس بُو کو ڈبو نہیں سکتے تھے..

اتنی بُو تھی..

اور اس کے باوجود یہ بُو کوئی اور محسوس نہیں کر سکتا تھا..

اس لیے بھی کہ ہر بُو کا ایک مذہب ہوتا ہے..

ایک الگ مذہب والے اُس بُو کے وجود کا احساس نہیں رکھتے.. ایک جدا تہذیب والے تو اُس کا گمان بھی نہیں کر سکتے..

اس تہذیب کی بُو اُس تہذیب تک کبھی نہیں پہنچتی.. اسی کو تہذیبوں کا



ٹکراؤ کہتے ہیں.. تہہ خانے میں سنٹرل ہیٹنگ کا بندوبست تو تھا نہیں اس لیے وہاں سردی اتنی تھی کہ وہ خود بھی ٹھٹھرتی تھی.. سردی تھی لیکن اُسے کوئی بھی محسوس نہیں کرتا تھا.. نہ وہ ادھ کھایا گھوڑا.. اور نہ وہ سات سوار جو اپنے تصور کامل کے گھوڑوں پر سوار یہاں تک آن پہنچے تھے..

اُن میں ایک نے ایک بونے کے کہنے پر ادھر کا رُخ کیا تھا..

ایک "بدی کی سلطنت" کو اپنے تئیں منتشر کر دینے والے باپ کا بیٹا تھا..

کوئی شریعت یا شہادت کے شوق میں یہاں پہنچ گیا تھا..

گھریلو زندگی کی بدی سے فرار حاصل کرنے والا بھی یہیں نیم مردہ تھا..

کسی کو گروزنی کا احسان چکانے اور امام شامل کے خواب کو پورا کرنے کی فکر تھی..

جانی کہتا تھا کہ عمارتیں جتنی بلند ہو جاتی ہیں اُن میں رہنے والے انسان اتنے چھوٹے ہوتے چلے جاتے ہیں اور وہ ایک نئے عقیدے کا کچّا کوٹھا تعمیر کرنے کی خواہش میں یہاں تھا..

اُس کا باپ پہلے کمیونسٹ تھا اور بعد میں یہودی..

"جانی.. تمہاری نسل کتنی بدنصیب ہے کہ تمہارے پاس خواب دیکھنے کے لیے.. ایک مقصد کے لیے کمربستہ ہونے یا ایک تصوّر کامل کے لیے جدوجہد کرنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا... ایک مہنگا گھوڑا.. ایک سبک رفتار ایک رقاص کی سی نزاکت کے ساتھ دوڑنے والا پونی براؤنی جو میں نے تمہارے شوق کی خاطر تمہیں خرید کر دیا ہے ایک تصوّر کامل کا متبادل تو نہیں ہو سکتا.. غلط یا صحیح اس کے بارے میں تم بحث کر سکتے ہو لیکن ہمارے لیے ہماری نسل کے لیے سوشلزم ایک ایسا تصوّر کامل تھا جو ہماری زندگیوں کو وقعت دیتا تھا.. ہم صدیوں کے بوسیدہ نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے تھے... ہم ریچڈ آف دی ارتھ کو... غریب کو.. کسان اور مزدور کو عزت نفس اور حکمرانی دینا چاہتے تھے.. ہاں میں جانتا ہوں کہ اس خواہش کے نتیجے میں جو سلطنت قائم ہوئی اور جن ملکوں میں اس کی پیروی کی گئی وہاں تبدیلی کے عمل کے دوران شخصی آزادیاں سلب ہوئیں کہ ہم اجتماعی آزادی کے دعوے دار تھے.. بیگار کیمپ وجود میں آئے.. لاکھوں لوگ فنا کر دیئے گئے.. قوموں کو ان کے آبائی وطن سے اکھاڑ کر بکھیر دیا گیا.. لیکن اس میں ہم خواب دیکھنے والوں کا.. ایک مکمل تصوّر کے لیے جدوجہد کرنے والوں کا تو کوئی دوش نہ تھا... تم یہ بھی تو دیکھو.. کہ فاشزم اور نازی ازم کے سیلاب کے سامنے ہمارے وجود نے بند باندھا.. لینن گراڈ اور سٹالن گراڈ میں ان کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹی.. اگر



ہم اپنے فلسفے پر یقین نہ رکھتے اور اُس سیلاب کے سامنے ریت ہو جاتے تو کیا آج مغربی یورپ کا وجود ہوتا.. ہم اتنے بڑے مجرم نہیں تھے جتنا ہمیں بنا دیا گیا.. سرمایہ دار قوتوں نے اگر سوویٹ یونین کو منتشر کر دیا ہے تو کیا اب صورت حال پہلے سے بہتر ہو گئی ہے.. جہاں پہلے پارٹی پروپوگنڈے کے پمفلٹ اور کتابچے چھپتے تھے تو اب اُن کی جگہ پورنوگرافک میگزین اور گلیمرس جرائد چھپتے ہیں تو کیا یہی آزادی ہے؟.. ماسکو اور سینٹ پیٹرزبرگ میں اب ماسکووچ ایسی بھدی اور بدنما کاروں کی بجائے اگر مرسیڈیز اور بی ایم ڈبلیو کے نئے نئے چمکدار اور چکنے ماڈل نہایت آہستہ خرامی سے سرخ چوک اور ونٹر پیلس کے پتھروں پر حرکت کرتے ہیں تو کیا یہی جمہوریت ہے.. فٹ پاتھوں اور گلیوں میں بھکاریوں کی تعداد راہگیروں سے بڑھ گئی ہے کہ ریاست کی جانب سے بوڑھوں اور لاچاروں کو قلیل سہی مگر پنشن ملتی تو تھی جواب بند ہو گئی ہے تو کیا یہی نتیجہ درکار تھا.. بالشوئی تھیٹر میں سوان لیک بیلے کی بجائے اگر پاپ سنگر اُچھلتے کودتے ہیں تو کیا یہی ثقافت ہے.. اس آزادی' جمہوریت اور نئی ثقافت کے دور میں رُوس کی سب سے بڑی ایکسپورٹ بھاری مشینری یا مِگ طیارے نہیں ہیں.. عورت کا گوشت ہے..
ہانگ کانگ اور بنکاک میں مقامی جسم فروشوں کا کاروبار ٹھپ ہو گیا ہے کہ ان کا جسم مختصر تھا اور رُوسی جسم کا حجم زیادہ ہے اور قیمت کہیں کم.. یہاں تک سینیگال اور ایتھوپیا میں قحط سے مرتے ہوئے مرد بھی انہیں افورڈ کر سکتے ہیں کہ قیمت اتنی کم ہے.. بمبئی اور کراچی تو بڑے شہر ہیں وہاں کے قصبوں میں بھی اب روسی بدن رائج ہے.. میرا ایک دوست دوبئی سے لوٹا تو اُس نے بتایا کہ وہ جس لڑکی کو اپنے ہوٹل کے کمرے میں لایا وہ رُوسی ادب کی ٹیچر تھی اور اسے پُشکن کی پوری شاعری یاد تھی اور وہ چھ زبانیں جانتی تھی لیکن نئے روس میں اس کے لیے کوئی جگہ نہ تھی... رُوس اب مصنوعی سیاروں کو خلا میں چھوڑنے کی بجائے گوشت پوست

کے بنے ہوئے زندہ سیارے دنیا بھر میں گردش کرنے کے لیے ایکسپورٹ کر رہا ہے....

نہیں نہیں میں ہرگز کمیونسٹ نظام کا دفاع نہیں کر رہا..

اگرچہ یہ نظام اب بھی دنیا کے بہت سے ملکوں میں رائج ہے.. اور وہاں یہ اس لیے قائم اور کامیاب ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اُس میں تبدیلیاں آتی رہی ہیں..

یہ صرف سوویٹ یونین کی ناکامی تھی.. لیکن ہم تو ماں کے کردار سے ہی سب کچھ پرکھتے ہیں.. اور سوویٹ یونین ماں تھی..

اُس نے دنیا بھر کے خواب دیکھنے والوں کو مایوس کیا ہے..

کہنا میں یہ چاہتا ہوں.. تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہم لوگ.. ہمارے عہد کے.. اور ہماری نسل کے نوجوان اپنی کاز پر اتنا گہرا یقین رکھتے تھے جتنا کہ شیروں کے آگے ڈالے جانے والے عیسائی.. فرعون کے سامنے نہ جھکنے والے ہمارے یہودی آباؤاجداد یا مکّہ کے بت پرستوں کے ہاتھوں اذیتیں جھیلنے والے محمدؐ کے پیروکار رکھتے تھے..

یہ سب بھی تو ایک تصور کامل کے حصول کے لیے ہی اپنی جانیں داؤ پر لگاتے تھے..

یہ اُمید کرنے والے لوگ تھے...

اور اُمید کرنے والے کبھی بے حرکت نہیں ہو سکتے...

اور جب وہ متحرک ہوتے ہیں تو انہیں ہمیشہ دہشت گرد کا متبادل کوئی بھی نام دیا جاتا ہے اُن قوتوں کی جانب سے جو اگرچہ اقتدار میں ہوتی ہیں لیکن سکوت اور جمود میں ہوتی ہیں اور وہ خوفزدہ ہوتی ہیں کہ یہ متحرک لوگ اُن کے نظام کو متزلزل کر دیں گے..



دونوں کا نکتۂ نظر سمجھ میں آتا ہے..

وہ جو اُمید کرنے والے ہوتے ہیں غیر متحرک نہیں ہو سکتے..

اور وہ جو جمود میں ہوتے ہیں متحرک ہونا افورڈ نہیں کر سکتے..

تمہیں یہ پاگل پن لگتا ہے ناں متحرک ہونا.. کسی کاز پر اتنا یقین رکھنا کہ اس کے لیے اپنی زندگی گنوا دینا..

لیکن ہم نے بے عزت ہونے.. غریب ہونے اور بے وجہ ہونے سے انکار کر دیا تھا.. کیونکہ ہمارے پاس اپنی زنجیروں کے کھونے کے سوا اور کچھ نہ تھا.. کھونے کے لیے..

اور ہم سے مراد میں.. واکر نہیں ہوں.. سب دنیاؤں کے باشندے ہیں اور بے شک میں ایک آسائش کی زندگی گزار تا تھا لیکن کہیں افریقہ یا ایشیا میں جانوروں ایسی زندگی گزارنے والے کے لیے بھی اپنی جان گنوا سکتا تھا..

اب کوئی انکار نہیں کرتا..

اجتماعیت کی جگہ انفرادیت نے لے لی ہے..

میری ڈبل روٹی پر اگر مکھن کا لیپ ہے تو مجھے کیا غرض کہ اس دنیا میں ایسے لوگ ہیں جو گھاس اور کیچڑ سے پیٹ بھرتے ہیں..

اسی لیے تم میں کوئی بھی اب خواب دیکھنے کے قابل نہیں رہا..

ایک پونی.. ایک سپورٹس کار.. بھرے بدن اور لمبی ٹانگوں والی ایک لڑکی.. بہترین شراب اور ہیروئن کا میسر آجانا تو خوابوں کا ایک حصہ نہیں بن سکتا..

ارنسٹو چے گویرا بھی تو ایک ایسا شخص تھا جس نے انکار کر دیا تھا.. اگرچہ وہ ایک کامیاب انقلاب کے بعد کیوبا کا نائب صدر تھا' محلوں میں رہائش رکھنے والا تھا لیکن اُس نے بولیویا میں جو بے عزت اور بے وجہ لوگ تھے ان کی بے عزتی اور بے وجگی کے تسلسل سے انکار کر دیا تھا.. امریکہ اور یورپ کی اُس عہد کی نوجوان

نسل کا وہ پوسٹر ہیرو تھا.. اُس نسل کے بیشتر نوجوان کمیونزم سے قطعی طور پر اتفاق نہیں کرتے تھے لیکن وہ اُن کا ہیرو اس لیے تھا کہ وہ ایک تصوّر کامل کی جدوجہد میں اپنی جان گنوا بیٹھا تھا..

تم اونگھنے لگے ہو جانی واکر...

بور ہو گئے ہو..

اپنے پسندیدہ پونی براؤنی پر رائڈنگ کے لیے جانا چاہتے ہو اور ایک بوڑھے شخص کے لیکچر میں دلچسپی نہیں رکھتے.... رائڈنگ کے بعد تم ایک چمکیلی تیز رفتار سپورٹس کار میں برابر کی نشست پر اپنی لمبی ٹانگوں والی گرل فرینڈ کو بٹھا کر وہاں لے جاؤ گے جہاں تم جیسے اور بھی ہیں۔ بہترین شراب اور ہیروئن میسر ہے.. میں تمہیں روکوں گا نہیں لیکن یہ تو بتا سکتا ہوں کہ تمہارے پاس کوئی خواب نہیں..

کسی تصوّر حیات کا نیا نقشہ نہیں..

جو بھی موجود حیات ہے تمہارے لیے بس یہی حیات ہے..

یہی مکمل سچ ہے اور یہی اوّل اور آخر ہے..

کس نے کہا تھا کہ جو انسان کسی مقصد کے لیے جان نہیں دے سکتا وہ اس قابل نہیں کہ زندہ رہے.. مارٹن لوتھر کنگ نے شاید!

جانی تم سمجھ رہے ہوناں..

جانی کچھ کچھ سمجھ رہا تھا..

لیکن تصوّر کامل پر اتنی شدت سے ایمان رکھنے والا باپ بھی ایک لمحے کے لیے سناٹے میں آ گیا جب ایک روز جانی نے اُسے بتایا کہ اس نے اپنا آبائی عقیدہ تبدیل کر لیا ہے.. مسلمان ہو گیا ہے اور عربی سیکھنے کے لیے یمن جا رہا ہے..



جانی تو کچھ کچھ سمجھ رہا تھا لیکن وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا.. اُسے جانی کے چاند پر چلے جانے سے اتنی حیرت نہ ہوتی جتنی اُس کے یوں یکدم اسلام قبول کر لینے سے ہوئی..

"جانی.. آئیڈیل تو مذہب سے ماورا ہوتا ہے.. اُس کی بنیاد الوہی نہیں انسانی سوچ پر ہونی چاہیے.."

"آپ نے ہمیشہ یہ بھی تو کہا کہ شیروں کے سامنے ڈالے جانے والے اوّلین عیسائی اور ہم.. آپ یہودی اور ہم مکہ کے بت پرستوں کے سامنے اپنے حق کا اعلان کرنے والے بھی اسی تصوّر کامل کی جستجو میں تھے.."

"ہاں.. اُس عہد اور ان انسانوں کے حوالے سے وہ ایسے ہی تھے.. لیکن ان زمانوں میں.. تصوّر کامل کسی مذہب یا عقیدے سے ماورا ہونا چاہیے.."

"کیوں؟"

جانی کا باپ چپ ہو گیا..

"کیوں ڈیڈی... آپ نے ہی تو مجھے یہ پٹی پڑھائی تھی کہ کسی مقصد.. اعلیٰ مقصد اور تصوّر کے بغیر زندگی گزارنا ایک حیوانی عمل ہے.. یاد ہے آپ بلیک مسلمز کو بے حد ایڈمائر کرتے تھے کہ یہ حیرت انگیز لوگ ہیں.. ان میں سے بیشتر قاتل.. غنڈے ڈاکو.. زنا کے مرتکب اور الکوہلک تھے اور جیلوں میں بند تھے.. اور پھر عالی جاہ محمد نے اُنہیں ایک راستہ دکھایا اگرچہ وہ خود راہ راست پر نہ تھے.. لیکن اُنہوں نے ایک تصوّر کامل تو دیا اور پھر وہی لوگ ایسے صابر و شاکر ہوئے کہ باقاعدگی سے عبادت کرنے لگے.. عورت اور الکوہل سے اجتناب کرنے لگے.. گلیوں بازاروں میں کھڑے اپنے عقیدے کی ترویج کے لیے پمفلٹ بانٹتے تھے اور جب لوگ اُن پر تھوکتے تھے تو وہ مسکراتے تھے اور کسی پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے... یاد ہے؟.. میں بھی میلکم ایکس کے افکار اور حیات سے متاثر

ہوا اور پھر اس نئے راستے کو تلاش کیا.. ہاں مجھے اس مذہب میں ایک تصوّر کامل دکھائی دیتا ہے.. پوری دنیا میں بدی کی قوتوں کے خلاف جہاد کیا جائے.. ایک ایسا نظام قائم کیا جائے جو عقیدے کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو..“

”تم یہودی رہ کر بھی تو ایک ایسے نظام کے لیے کوشاں ہو سکتے تھے..“

”سٹیٹ آف اسرائیل کے لیے؟“

جانی کا باپ پھر چپ ہو گیا..

یہودیوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ چپ رہتے ہیں..

گُنگ رہتے ہیں..

بولتے نہیں..

بے شک وہ فرائڈ یا آئن سٹائن ہوں بولتے نہیں.. اگر وہ بولتے تو اب تک مکمل طور پر فنا ہو چکے ہوتے.. ہزاروں برسوں سے سونے سے پیشتر دنیا کا ہر یہودی بیت المقدّس واپسی کے لیے خدا سے دعا کرتا ہے مگر باہر چپ رہتا ہے.. ان کی دعا قبول ہو چکی ہے پھر بھی وہ دعا مانگتا جاتا ہے.. لیکن وہ تبھی چپ رہتا ہے جب کمزور ہوتا ہے.. اور جب اُس کے پاس قوت آجائے تو وہ دوسروں کو فنا کر دینے والی مشین بن جاتا ہے....

اُن میں ایک اور خوبی بھی ہے.. وہ کبھی کبھار کسی تصوّر کامل کے لیے اپنے عقیدے کو بھی فراموش کر دیتے ہیں..

یہ پہلی بار تھا جب جانی کا باپ چپ ہوا اس کے عقیدے کی تبدیلی پر..

دوسری بار وہ تب چپ ہوا جب جانی نے افغانستان جانے کا ارادہ ظاہر کیا..

”کیوں؟“

”آپ کے والد نے آپ سے پوچھا تھا کہ آپ کمیونسٹ کیوں ہو گئے تھے“



”نہیں..“

”چے گویرا سے کسی نے پوچھا تھا جب وہ سب کچھ ترک کر کے بولیویا جا رہا تھا؟“

”اگر اُس کا باپ زندہ ہوتا تو ضرور پوچھتا.. کہ کیوں؟ اسی لیے میں تم سے پوچھنے کا حق رکھتا ہوں..“

”اسلام نے مجھے مقصدیت دی ہے.. ایک کاز دی ہے.. گناہ۔ ثواب۔ دوزخ اور بہشت اور بھائی چارے کا ایک تصوّر دیا ہے..“

”یہ سب تصوّر تو عیسائیت اور جوڈاازم میں بھی موجود ہیں..“

”لیکن یہ ساکن عقیدے ہیں اور اسلام متحرک ہے.. آپ اپنا لیکچر بھول گئے ہیں کہ.. اُمید کرنے والے غیر متحرک نہیں ہو سکتے.. میں طالبان کا ساتھ دینا چاہتا ہوں“..

”طالبان.. کم آن جانی تم سیریس نہیں ہو سکتے“

”میں اتنا ہی سیریس ہوں جتنے کہ شیروں کے سامنے ڈالے جانے والے عیسائی ہوا کرتے تھے ڈیڈی..“

جانی کے باپ کا چہرہ جتنا دُکھ سنبھال سکتا تھا‘ اس پر اتنا تھا اور جتنا غصہ عیاں ہو سکتا تھا بس اتنا ہی تھا ”تم اُن جاہل اور وحشی مُلّاؤں کا ساتھ دینے جا رہے ہو جنہوں نے افغانستان کو پتھر کے زمانے میں دھکیل دیا ہے جانی.... جہاں رباب بجانا جرم ہے... فٹ بال کے نوجوان کھلاڑیوں کے سر مونڈھ دیئے جاتے ہیں کیونکہ وہ نیکریں پہن کر کھیل رہے ہوتے ہیں اور یوں ان کی ٹانگیں دیکھ کر ملاؤں کے ایمان خراب ہوتے ہیں... تمام عورتوں کو برقعوں میں دفن کر دیا گیا ہے اور بچیاں سکول نہیں جا سکتیں.. ہسپتالوں میں لیڈی ڈاکٹروں کو جواب دے دیا گیا ہے اور وہ برقعہ اوڑھے کابل کی گلیوں میں بھیک مانگتی ہیں.. مردوں کی داڑھیاں مٹھیوں

میں بھینچ کر ناپی جاتی ہیں اور اگر ان کے بال مٹھی سے باہر نہ نکلیں تو انہیں بید مارے جاتے ہیں.. جانی خدا کے لیے تم کیسے نظام کی مدافعت کے لیے جارہے ہو.. کسی عورت کے اگر ٹخنے نظر آ جائیں تو اُسے سربازار رسوا کیا جاتا ہے.. گالیاں دی جاتی ہیں اور ٹخنوں پر بید رسید کیے جاتے ہیں... ہزاروں بیوائیں اپنے بچّوں سمیت بھوکی مر رہی ہیں کیونکہ عورت کو کام پر جانے کی.. بلکہ تنہا باہر جانے کی بھی اجازت نہیں... فوٹوگرافی کی بھی ممانعت ہے.. ٹیلی ویژن توڑ دیئے گئے ہیں... نہ صنعت ہے نہ تجارت ہے اور نہ تعلیم.. ملا عمر جو کبھی قندھار سے باہر ہرات تک نہیں گیا اُس کا اندھا راج ہے.. اور تم اُن کی صفوں میں شامل ہونے کے لیے جارہے ہو..''

''ہاں..'' جانی نے صرف اتنا کہا..

''لیکن کیوں؟''

''چے گویرا سے کسی نے پوچھا تھا کہ کیوں.. اگر اُس کا باپ زندہ ہوتا تب بھی نہ پوچھتا کہ کیوں.. لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں کہ کیوں... انہوں نے بھی بقول آپ کے... انکار کیا ہے... بیوقوفی کی حد تک اپنے مؤقف پر قائم رہے ہیں.. وہ بے شک قدرے گمراہ ہیں لیکن اپنے مقصد کے حصول کے لیے.. اپنے تصوّر کامل کے لیے کھرے ہیں.. اُن میں جہالت بے شک ہے لیکن کھوٹ نہیں.. وہ مکمل اختیار رکھنے کے باوجود ایماندار ہیں اور اُن پر بے شک سو الزام سہی لیکن کرپشن کا الزام نہیں... کیا آپ دنیا کی کسی اور ریاست اور اس کے حکمرانوں کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں؟.... اسی لیے دنیا کی بہت کم ریاستوں نے اُنہیں قبول کیا ہے کہ اُن کی موجودگی میں موازنہ ہو جاتا ہے.... اور یہ موازنہ بہت سے چہروں پر کالک مل دیتا ہے.. انہوں نے تاریخ میں پہلی بار اپنے ملک کو ہتھیاروں اور افیم سے پاک کیا ہے.. عورتوں کے حقوق چھینتے ہیں لیکن



اُن کو ایک غیر متوقع احترام اور عزت نفس لوٹاتے ہیں... بے شک وہ قدرے بھٹکے ہوئے ہیں لیکن وہ ایک تصوّر پر مکمل یقین رکھتے ہیں آپ کی نسل کی مانند... آپ کی نسل نے بھی تو کمیونزم کی جہالت اور ظلم کو صرف اس لیے برداشت کیا کہ آپ کے سامنے ایک بڑا مقصد تھا جس کے حصول کے لیے یہ سب کچھ جائز ٹھہرتا تھا.. آپ کی پسندیدہ ریاست نے بھی تو لاکھوں لوگوں کو قتل کیا.. دہشت کو اپنا آئین بنایا.. ٹروٹسکی کو مرتد ٹھہرایا اور قتل کروایا.. آپ اپنے عقیدے کی پختگی میں ان ملاؤں سے بدتر تھے کیونکہ آپ سب تو پڑھے لکھے تھے اور اس کے باوجود مارکس کے ترازو پر جو پورا نہ اترتا تھا اسے بید نہیں مارتے تھے جان سے مار دیتے تھے... آپ بھی تو گمراہ تھے اپنے وقت کے طالبان تھے.. ان سے بدتر تھے.. طالبان نے صرف اسلام کی تشریح یا تصریح میں مار کھائی ہے آپ کی طرح دیگر قومیتوں پر اپنا نظام نہیں ٹھونسا.. آپ مجھے یہ بتا دیجئے کہ اگر اس لمحۂ موجود میں.. مجھے اپنی زندگی کو وقار دینے کے لیے یہی زندگی قربان کرنے کی خواہش ہو تو میں اور کہاں جاؤں گا..''

جانی کے باپ کو احساس ہو گیا کہ پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ گیا ہے اور وہ پانی کبھی واپس نہیں آسکتا اس لیے وہ پھر چپ ہو گیا..

''میں اُن کی کمزوریوں اور جہالت سے آگاہ ہوں ڈیڈی لیکن اُن کی سادگی۔ ایمانداری اور مکمل یقین کا مداح ہوں.. وہ انکار تو کر رہے ہیں.. اور میں اُن کا ساتھ دینا چاہتا ہوں''

''تم جیت نہیں سکتے..''

''ہاں.. میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ ایک ہاری ہوئی جنگ ہے... پھر بھی لڑنا چاہتا ہوں.. تصوّر کامل ہمیشہ ہار جاتا ہے.. اگر وہ جیت جائے تو تصوّر کامل نہیں ہوتا... اس کے لیے مرنے والوں کی موت مکمل ہوتی ہے جب کہ جیت جانے

والے ہمیشہ ایک بے یقین موت مرتے ہیں..“

”تم ایک سنجیدہ نوجوان ہو جانی یہ میں جانتا ہوں.. اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہیں ہمیشہ سے علم اور سچ کی تلاش رہی ہے.. لیکن تمہاری ماں.. جس سے میری علیحدگی ہو چکی ہے کہتی ہے کہ تمہاری برین واشنگ کی گئی ہے ورنہ تم ایسے تو نہ تھے...“

”ہر عقیدہ ایک برین واشنگ ہی تو ہوتی ہے ڈیڈی... اگر ایسا نہ ہو تو مذہبی تاریخ میں کوئی نیا عقیدہ کبھی قبول نہ کیا جائے.. موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام نے بھی یہی کیا اور پھر ہمارے پیغمبرؐ نے بھی جو گزشتہ خیال اور بت تھے انہیں ذہنوں سے واش کر کے نئے خیال اور نئی سوچ کو داخل کیا.. تو ممی بالکل درست کہتی ہیں کہ میری برین واشنگ ہو چکی ہے ورنہ میں ایسا تو نہ تھا.. سوال یہ ہے کہ میں ویسا رہنا نہیں چاہتا تھا اس لیے ایسا ہو گیا ہوں..“

”تم اپنی عمر سے بڑی باتیں کرتے ہو جانی...“

”یہ باتیں آپ ہی نے مجھ میں انجیکٹ کی ہیں..“

”تو تم ہارنے کے لیے وہاں جانا چاہتے ہو؟“

”ہاں...“



گھوڑے کی ٹانگیں ایک عجیب سے زاویے پر اکڑی ہوئی تھیں.. جیسے لکڑی کا ہو.. کھلونا ہو اور کسی بچے نے اُسے گرا دیا ہو..

دوسری سیڑھی پر ٹھہری ہوئی چاندنی کے کچھ ذرّے دھیرے دھیرے اُترتے گھوڑے کے ڈھانچے کو تاریکی میں سے الگ کرتے تھے..

پسلیاں گوشت سے عاری ننگی ہو رہی تھیں جیسے وہ کسی قصاب کی دوکان پر پڑا ہو.. اُن میں سے تراشے ہوئے پارچے کچھ نگلے گئے تھے اور کچھ قے کے ساتھ باہر آ گئے تھے اور اب اُس کی سرد ہو چکی لید پر اکڑے پڑے تھے..

جانی کا زخم خوردہ وجود کبھی اس کے گرم پیشاب سے کچھ شفایاب ہوا تھا مگر یہ عارضی آرام تھا' اذیت پھر سے لوٹ آئی تھی اور ٹیسوں کی سُولیں بدن میں بھرتی تھی.. بھوک کا تیزاب اس کی انتڑیوں کو اور اُس کے بدن میں جتنی بھی شریانیں اور رگیں تھیں انہیں گلا کر ریزہ ریزہ کر چکا تھا.. کوئی واضح بدنی نظام باقی نہ رہا تھا.. گوشت کی ایک دلدل تھی جس میں سے خون جانے کیسے راستے تلاش کر لیتا تھا جو ابھی تک رواں تھا.. تھوڑی سی خوراک اس گوشت کی دلدل کو پھر سے زندگی دے سکتی تھی لیکن اس کے باوجود.. وہ گھوڑے کو نہیں کھا سکتا تھا.. تہہ خانے کے باقی پناہ گزین بھی کہیں نہ کہیں ادھ موئے یا جانے پورے موئے ہوئے پڑے تھے..

جانی نے بمشکل اپنا ہاتھ اُٹھا کر گھوڑے کی پشت پر رکھا.. اُسے تھپکا..

"سوری.. میں نے تمہیں شُوٹ کیا.."

اس تھپکی سے گھوڑے کا بدن تھرتھرایا نہیں.. جیسے کہ اس کے براؤنی کا بدن اس کے ہاتھ کے لمس کو محسوس کرتے ہی تھرتھرانے لگتا تھا.. وہ برف ٹھنڈک میں اکڑا ہوا مردہ تھا..

"ہاں.. میں نے تمہیں شوٹ کیا لیکن.. میں تمہیں کھاؤں گا نہیں.."

اوپر.. تہہ خانے کے اوپر قلعہ جنگی کے وسیع صحن کی گرد میں اَٹی جتنی بھی لاشیں اکڑی پڑی تھیں، ان میں سے بے شمار سر بریدہ تھیں۔ ان میں سے ایک کا سَر اس کے آس پاس نہیں گرا تھا، دھماکے سے بہت دور ایک گڑھے میں جا گرا تھا.. وہ ایسے زاویئے پر اٹکا ہوا تھا جیسے عجائب گھر میں دھڑ سے الگ بدھا کا کوئی سَر نمائش پر ہو.. البتہ اس کا چہرہ بدھا کی مانند صاف ستھرا نہ تھا.. نین نقش واضح نہیں تھے۔ ان پر خون کی پپڑیاں جمی تھیں اور گھاؤ تھے.. البتہ اس کے ہونٹ بقیہ چہرے سے الگ صاف دکھائی دے رہے تھے.. یہ ہونٹ مگر چاندنی میں واضح نظر آرہے تھے اور یہی ہونٹ شائد وا ہوئے.. میرا دھڑ بیکار پڑا ہے جانی.. تم مجھے کھا سکتے تھے.. میرا تمہارا تو کوئی رشتہ نہیں.. جیسا کہ براؤنی کے ساتھ تھا.. تم نے تو آج تک مجھے دیکھا بھی نہیں تو تم مجھے کھا سکتے تھے.. مجھے نہیں میرے بقیہ دھڑ کو جو میں نہیں جانتا کہ کہاں پڑا ہے.. اور اس دھڑ کو بھی علم نہیں کہ جس سَر کے پاس اسے متحرک اور زندہ رکھنے کی باگیں تھیں، وہ کہاں ہے.. سنتے ہو جانی..

نیچے تہہ خانے میں جانی نے سنا نہیں..

ہونٹ بڑبڑاتے رہے.. تم مجھے کھا سکتے تھے.. تم مجھے..

ان کی آواز خود اس سر کے کان نہیں سن رہے تھے تو تہہ خانے میں پڑا جانی کیسے سن لیتا..



کتنے روز ہو گئے تھے وضو کیئے ہوئے.. نماز کی نیّت کیئے ہوئے.. اپنے آپ کو مصفّا کیئے ہوئے.. جانی کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور سر کے بال اس کے بالوں میں الجھتے تھے اور اگر اس کی داڑھی ایک مٹھی میں بھینچی جاتی تو بھی اس کے بال اس سے باہر ہوتے.. اور وہ ایک مخمور شخص کی مانند گھوڑے کی پشت پر ہاتھ رکھے اسے سہلاتا تھا.. میں تمہیں کھاؤں گا نہیں..

گھوڑا اسی طرح اکڑا ہوا لکڑی کا زمین پر گرا ہوا کھلونا رہا.. لیکن شائد اس نے تھوتھنی اٹھائی.. گردن سیدھی کی.. ایال کے بال جیسے ہوا کے ایک نامعلوم جھونکے سے سرسرائے.. جانی میں جانتا ہوں کہ تم مجھے کیوں نہیں کھا سکتے..

جانی کے بدن میں اذیت کا جو قیمہ تھا.. انتڑیاں، رگیں، شریانیں جو گچھا مچھا ہو چکی تھیں، وہ سب مجتمع ہو کر حیرت میں ہوئیں کہ ایک مرا ہوا.. اکڑا ہوا.. بدن دریدہ گھوڑا.. اس کا بچا کھچا ڈھانچہ کیسے بول سکتا ہے... لیکن اسی حیرت نے نیم مردنی کے باوجود ایک سوال "کیوں؟" کی صورت میں کیا..

"میں وہی پونی ہوں.. تمہارا پیارا، پسندیدہ براؤنی جس پر تم سواری کیا کرتے تھے.. جس کی پشت تھپکتے تھے.. اور تمہاری ہتھیلی تلے میرا بدن خوش ہو کر تھرتھراتا تھا.. میں وہی ہوں.. تم مجھے چھوڑ کر یہاں چلے آئے تو میں بھی تمہیں سونگھتا یہاں تک چلا آیا.. جانی اگر.. فرض کرو کہ اگر.. تم پھر سے اپنے گھر پہنچ جاؤ.. ویسے ہو جاؤ جیسے تمہاری نسل کے دوسرے نوجوان تھے تو کیا پھر بھی تم یہاں آنے کا فیصلہ کرو گے.."

"ہاں..."

"تمہیں کوئی پچھتاوا نہیں؟"

"نہیں.."

"تم زندگی میں پہلی بار ننگے پاؤں ہو.. تمہارے تلوے زخمی اور پیپ سے

بھرے ہیں.. ملیشئے کی شلوار قمیض تمہارے بدن سے یوں چپ چکی ہے کہ اسے اتارو گے تو تمہاری جلد بھی اس کے ساتھ اترتی چلی جائے گی.. تمہارا سیاہ رنگ کا سویٹر جمے ہوئے خون سے اکڑا ہوا ہے.. تم پر لال بیگ رینگتے ہیں اور بالوں میں جوئیں سرسراتی ہیں اور تمہاری حالت مردوں سے بدتر ہے.. پھر بھی کوئی قلق نہیں.."

"نہیں.."

قلعہ جنگی کے صحن میں اتری ہوئی مگر چاندنی بھی بیزار ہوئی اور تہہ خانے کی تیسری سیڑھی پر اتر کر سرگوشی میں بولی "نہیں؟"

"نہیں.." جانی بڑبڑایا اور اس کا ہاتھ گھوڑے کی پشت سے گرا اور وہ نقاہت کی تاب نہ لا کر ڈھے گیا..

گڑھے میں پڑے سر کے ہونٹ ایک مسکراہٹ میں پھیل گئے.. انہیں نروان حاصل ہو گیا تھا..



جانی اگرچہ پوری شدت سے بڑبڑایا تھا.. "نہیں" کہا تھا اور ڈھے گیا تھا تو یہ نہیں کہ وہ تہہ خانے کے گھپ اندھیرے میں گمنام اور چپ چاپ گرا تھا.. نہیں.. اس کے "نہیں" کو اُس کی پسلیوں نے جب کہ وہ فرش پر گرا تھا، سنا تھا.. اور گل شیر ولی کے ایک کان نے سنا تھا..

اگرچہ وہ مرے ہوئے لگتے تھے لیکن نیم بے ہوشی کی غفلت بھری ایسی نیند میں تھے جو بھوک، نقاہت اور موت کی قربت کے باعث ایک سیاہ دھند کی مانند اترتی ہے.. اس غافل مدہوشی میں پورا نظامِ بدن مفلوج ہو جاتا ہے لیکن سَر کے اندر دماغ کے گمشدہ خلیوں میں کہیں کہیں آوازیں اور زندگی کے آثار دستک دیتے رہتے ہیں.. جیسے جان کنی کے عالم میں.. جب جان ایک بیلنے کے شکنجے میں آئی ہوتی ہے اور نکلنے کا نام نہیں لیتی تو بدن ساتھ چھوڑ دیتا ہے لیکن دماغ کے خلیے مرنے سے انکار کر دیتے ہیں.. ان کی حدّت دھیرے دھیرے سرد ہوتی ہے.. جیسے برسوں سے دھونی رمائے سادھو.. بنا کھائے پئے بیٹھے رہتے ہیں، نبض معدوم سی ہوتی ہے، زندگی کے کوئی آثار باقی نہیں رہتے لیکن ان کے سر پر ہاتھ رکھا جائے تو ہتھیلی پر دماغ کی ایک ہلکی سی دستک محسوس ہوتی جاتی ہے..

وہ سب اسی قسم کی مفلوج شدہ نیم مردہ حالت میں وہ دستکیں محسوس کرتے تھے.. گل شیر والی نے بھی جانی کی "نہیں" کی یہ دستک اسی طور محسوس کی تھی..

دِیر اس دستک کے پار تھا..

دِیر بہت دور تھا..

اور دور سے دستکیں آتی چلی جاتی تھیں..

دیر میں برف گرتی تھی.. تمرگڑھ اور شہرِ دیر میں.. لیکن وہاں اتنی سردی نہیں ہوتی تھی.. دِیر کے پار چترال کو جانے والا درہ لواری تو برف سے ڈھک جاتا تھا اور اس میں سے کوئی بھی گزر نہیں سکتا تھا سوائے بھیڑیوں اور چیتوں کے.. لیکن وہاں بھی اتنی سردی نہیں ہوتی تھی.. یہ کیسا مزار شریف ہے جہاں اتنی سردی ہوتی ہے.. یارا اس تہہ خانے میں کوئی لکڑی مکڑی جلاؤ.. بہت سردی ہے..

یہ امریکی گورا جو "نہیں نہیں" کرتا، کیا پتہ مر گیا ہے۔ اس کو گھوڑوں سے کیا الفت ہے..

بھوک سے مرتا ہے یارا لیکن اسے کھاتا نہیں..

ایک جانور کو خدا بنالیا ہے.. ان گوروں کا کچھ سمجھ نہیں آتا.. ادھر سیاہ پگڑی باندھ کر ہمارے ساتھ جہاد کرنے کو آجاتا ہے لیکن گورا ہی رہتا ہے..

یارا گھوڑا تو اچھا جانور نہیں ہے.. یہ تو بندے کو ذلیل کرتا ہے.. ساتھ چھوڑ جاتا ہے.. جو اس کی پیٹھ پر سوار ہو جائے، اس کے ساتھ چلا جاتا ہے، کبھی مُڑ کر بھی نہیں دیکھتا، ایسا بے وفا جانور ہے۔



اپنا دیر کے نواب کے اصطبل میں بھی کیسا کیسا بے وفا گھوڑا تھا..

نواب یا تو گھوڑا کا شوقین تھا اور یا کتّا کا..

عورت کا بالکل نہیں..

دن رات گھوڑا اور کتا کے ساتھ رہتا تھا..

اس نے یارا اپنا کتا کا شادی بنایا... جشن کیا.. تو پوری ریاست میں خوشی کیا اور ہم جیسے لوگوں کو بھی مفت میں روٹی اور گوشت کھلایا.. تو گھوڑے سے تو کتا اچھا ہے جس کی شادی پر بھوکے کو روٹی مل جاتا ہے..

جتنا اس کے ہاں کتّا تھا سب کا شادی نہیں بنایا.. نہیں تو ہمیں روز روز روٹی نصیب ہو جاتا..

میرا یہ جو پاؤں ہے جس میں بوٹ ہے تو پہلے نہیں تھا.. جہاد پر آیا تو ملا..

میرا پاؤں اس جوتا یا چپل وغیرہ کو نہیں جانتا تھا.. ہم کو تو یارا معلوم نہیں تھا کہ اس خانہ خراب پاؤں میں کوئی چیز پہنتا ہے.. بچپن سے ننگے پاؤں پھرتا اور بوجھ ڈھوتا تھا.. اس لیے ہمارا پاؤں بہت بڑا ہو گیا.. میرے سر کے موافق بڑا ہو گیا اور اس میں.. اس کا تلوے میں دراڑیں پڑ گیا جن میں بے شک کیڑا مکوڑا گھر بنا لے تو بھی خبر نہیں ہوتی تھی.. اللہ تعالیٰ کیڑے کو پتھر میں بھی رزق دیتا ہے یہ ہمارا ایمان ہے تو پاؤں کے تلوے میں اگر وہ گھر بناتا تھا تو اس کا رزق تھا..

میں تب کتنے برس کا تھا؟

بہت چھوٹا تھا..

ہو گا کوئی چھ سات برس کا جب برف میں چل کر.. جب میرے پاؤں کی دراڑوں میں کیڑا لوگ گھر بناتا تھا.. تو میں اصطبل کو پہنچتا تھا..

اصطبل میں اپنا بوڑھا.. اپنا والد لوگ نواب کے گھوڑا لوگ کی لید صاف کرتا تھا اور ان کو غسل دیتا تھا.. انہیں ستھرا کرنے کے واسطے صابن لگاتا تھا.. خود

ہمارے گھر میں تو کبھی صابن نہیں آیا.. میرا بوڑھا والد تب مجھے بولتا تھا کہ صابن صرف گھوڑا اور کتا کو نہلانے کے لیے ہوتا ہے، انسان کے لیے نہیں.. بعد میں میں بڑا ہوا تو معلوم ہوا جھوٹ بولتا تھا، ہمارے پاس پیسہ نہیں تھا صابن خریدنے کو... یارا ہم مدرسہ گیا تو ادھر ہم کو صابن بھی ملا..

تو میں نواب کے اصطبل کو پہنچتا تھا برف میں اپنے پاؤں سے چل کر.. اپنا بوڑھا والد کی مدد کرنے کے لیے..

اِدھر جب اِس گھوڑے کا لید اور پیشاب خطا ہوا ہے تو یہ امریکی کیسے اس میں مزے کرتا تھا کہ یہ زخم کے لیے اچھا ہے.. ہم تو یارا اسی لید اور پیشاب میں پیدا ہوا تھا پھر بھی ہمارا زخم تو ٹھیک نہیں ہوتا تھا..اِدھر اگر کچھ دن کے لیے فاقہ آگیا تو خیر ہے، اُدھر بھی ایسا ہو جاتا تھا.. ہم کو فاقہ کا پریکٹس ہے یارا.. یہ باہر کا انگریز لوگ جب ہمارے بارے میں کہانی بناتا ہے تو لکھتا ہے کہ یہ پٹھان قوم بہت طاقتور اور مضبوط ہوتا ہے اور کسی کے سامنے جھکتا نہیں تو اس بیٹی چو کو کیا پتہ کہ دو چار پٹھان تو ایسا ہوتا ہے پر باقی سب تو نواب اور خان کے سامنے جھکتا ہے.. ویسا ہی ہوتا ہے جیسے بنگال کا بھوکا اور غریب ہوتا ہے.. ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا.. باہر بیٹھ کر کہانی بناتا ہے۔ کبھی میرے جیسا اصطبل والا لوگ کو نہیں ملا..

میرا بوڑھا والد بھی ایسا ہی تھا.. بھوکا اور غریب.. چھ بچّہ پیدا کر لیا تھا.. اس کا پیٹ بھرنے کے لیے گھوڑا کا لید اور پیشاب صاف کرتا تھا.. پھر بھی چھ پیٹ بہت ہوتا ہے، وہ بھرتا ہی نہیں.. بچّہ لوگ بدبخت کھاتا بھی بہت ہے.. کبھی وہ گھوڑا کا دانہ چوری کر کے لے آتا تھا تو اماں اسے چولہے پر ابال کر ہم کو کھلاتا تھا تو ہم مزہ کرتا تھا.. کبھی مکئی کا دانہ بھی ملتا تھا..

تو میں اپنا بوڑھا والد کا مدد کرنے کو برف میں اپنے پاؤں سے چل کر اصطبل کو جاتا تھا..



بوڑھا جب تک مجھے نہیں دیکھتا تھا، کام میں جتا رہتا تھا۔ پر جب مجھے آتا دیکھ لیتا تھا تو گر جاتا تھا اور کہتا تھا بچّہ ہمارا سکت ٹوٹ گیا.. بس تھوڑا لید اور پیشاب رہ گیا ہے، اسے تم صاف کر دو..

یارا اِدھر جتنا بھی گھوڑا تھا اور بہت تھا.. وہ مجھے لگتا تھا کہ عام گھوڑا کی نسبت زیادہ لید کرتا تھا، زیادہ پیشاب کرتا تھا.. اور بہت گھوڑا تھا.. بے وفا اور ذلیل جانور ہے یارا.. پورا رات صفائی کرتا تھا، پھر بھی لید ختم نہیں ہوتا تھا.. اصطبل کے آخر تک صفائی کرتا تھا تو پچھلے والا حرامی گھوڑا پھر لید کر دیتا تھا.. جھاڑو ٹوٹ جاتا تھا تو پھر ہاتھ سے اسے صاف کرتا تھا.. ہفتے میں صرف ایک جھاڑو کا اجازت تھا.. وہ ٹوٹ جاتا تو پھر اور کیا کرتا.. ہاتھ سے کرتا..

ویسے اللہ کا شکر ادا کرتا تھا.. ہمارا گزارا مزارا ہو جاتا تھا.. اور کئی لوگ تھا جن کے پاس ایسا نوکری بھی نہیں تھا..

پھر ہمارا بوڑھا سے ایک غلطی ہو گیا..

بوڑھا کے دماغ میں شاید لید چلا گیا اور وہ دیوانہ ہو گیا۔ ساری عمر لید میں رہا تو خود بھی لید ہو گیا یارا..

ایک روز نواب کا سواری کے لیے ایک گھوڑا خوب لشکا مشکا کے تیار کیا.. اس کو کاٹھی ڈالا ہے تو مجھ سے بولتا ہے.. ”گل شیر ولی.. یارا میں آج تک کسی گھوڑے پر نہیں بیٹھا.. گدھے کا سواری کیا ہے.. ٹٹو پر بھی بیٹھا ہے، پر ایسا گھوڑا پر کبھی نہیں بیٹھا.. تو تھوڑا مزا کرتا ہے اس پر بیٹھتا ہے..“

”تو بیٹھو بابا..“ میں نے ہنس کر کہا اور اس کا مدد کیا گھوڑے پر بیٹھنے کو..

یارا میرا بوڑھا گھوڑا پر بیٹھا ہے تو بالکل نواب کی مانند بیٹھا ہے.. بس اس کا کپڑا مپڑا کچھ گندا مندا اور پھٹا ہوا تھا، پر اس کا کمر سیدھا تھا، نواب کی طرح اور اس کا چہرے پر ایسا خوشی تھا کہ میں کیا بیان کروں یارا.. مجھ سے کہتا ہے ”گل شیر ولی..

یہ گھوڑا بھی کیا بلا ہے یارا.. اس پر بیٹھ جاؤ تو نیچے کا چیز چھوٹا دکھائی دیتا ہے.. اور اترنے کو جی نہیں چاہتا.."

تھوڑی دیر بعد میں نے بولا کہ اب نیچے آجاؤ.. تو وہ کہتا ہے، نہیں ابھی تھوڑا اور مزا کرے گا..

بس ہمارا بوڑھا سے یہی غلطی ہو گیا.. اصطبل کا منشی ادھر آگیا اور اس نے نواب کو شکایت کر دیا کہ یہ بوڑھا آپ کا گھوڑا پر سواری کرتا تھا.. نواب بن کر بیٹھا تھا.. یہی غلطی ہو گیا کہ جلدی سے نیچے نہیں اترا.. بیٹھا رہا..

اور نواب تو یارا خدا ہوتا ہے.. خدا تو معاف کر دیتا ہے پر نواب نہیں کرتا، وہ ہمارا بوڑھا سے بولا۔ "اوئے خبیث کا تخم... ہمارا گھوڑا پر بیٹھتا ہے.. اس کا بے عزتی کرتا ہے حرام کا اولاد.. اس پر ہم بیٹھتا ہے تو ہمارا وزن نہیں ہوتا، تم نوکر لوگ کا وزن ہوتا ہے اور گھوڑے پر بوجھ پڑتا ہے اور اس کا بے عزتی ہوتا ہے.."

یارا اس نے ہمارا بوڑھا کو عجیب سزا دیا.. اور ٹھیک دیا.. بوڑھا کے دماغ میں لید بھر گیا تھا.. نواب نے ہمارا بوڑھا کو کہا کہ تم گھوڑا بنو اور ہم تم پر سواری کرے گا تاکہ تمہیں معلوم پڑ جائے کہ ہمارا گھوڑا بے چارہ کا کیا حال ہوا تھا..

ہمارا بوڑھا خوشی خوشی گھوڑا بن گیا یارا.. نواب چابک مارتا تھا تو وہ اور خوش ہوتا تھا کہ ہمارا قسمت کتنا اچھا ہے کہ نواب خود چابک مارتا ہے.. بوڑھا نے اس کو میدان کا پورا چکر لگوایا اور اسے خوش کرنے کو گھوڑا کے موافق بولا بھی..

لیکن نواب خوش نہیں ہوا یارا، ہمارا بوڑھا کو نوکری سے رخصت کر دیا...

گھر میں جو بچّہ لوگ تھا، اس کے پیٹ میں جو گھوڑا کا دانہ جاتا تھا، وہ بند ہو گیا.. ہمارا بوڑھا بھی نوکری کے ساتھ ہی تھوڑا دن میں رخصت ہو گیا۔ پر اس نے اپنا موت سے ایک دن پہلے بولا تھا۔ "یارا گل شیر.. نواب کہتا تھا کہ اس کا وزن



نہیں.. پر جب وہ گھوڑا بنا کر میری پشت پر بیٹھا ہے تو یارا اس کا تو کل جہان سے زیادہ وزن تھا.. جھوٹ بولتا تھا۔"

چھ بچّہ میں سے ہم تیسرے نمبر پر آیا تھا.. دو بہن تھا جس کو اماں نے شادی کے لیے بیچ دیا اور اس کا پیسہ ہمارے پیٹ میں ڈال دیا... پھر بھائی لوگ ادھر ادھر ہو گیا.. ایک کراچی نکل گیا اور اس کا چوکیداری کا نوکری لگ گیا.. دوسرا لاہور میں دانے کا بھٹی دھکیلتا تھا.. دونوں اچھا کمائی کرتا تھا، پر ادھر گھر کو کچھ زیادہ مدد نہیں کرتا تھا.. اور تیسرا بھائی اماں کی گود سے الگ نہیں ہوتا تھا، اس کا لاڈلا تھا۔ وہ لاڈ پیار سے اور تھوڑا بھوک سے لاغر ہو کر مر گیا..

میرا کیا ہوا؟

میرا یہی ہوا جو ہو رہا ہے..

یارا ہمارے برابر میں سوات کا ریاست تھا... بلکہ دیر کے راستے میں پڑتا تھا۔ ادھر بھی ہم جیسا لوگ کا قبیلہ برادری تھا۔ پر ان کا والی بادشاہ کوئی نیک اور بہت سیانا بزرگ تھا.. نیا نیا کام کرتا تھا.. اس نے ادھر سکول، کالج، ہسپتال کھولا.. سڑک بنایا... ادھر ہمارا نواب تو صرف کتا کی شادی پر کھانا کھلاتا تھا.. لواری کا دوسری طرف چترال میں بھی مہتر لوگ نے اچھا کام کیا لیکن ادھر دیر میں ہم ویسا کا ویسا ہی رہا جیسا سینکڑوں سال سے تھا.. اور ہمارا ریاست سوات اور چترال کی نسبت کیا خدا کی شان ہے یارا، مقابلہ ہی نہیں تھا حسن کا.. ایسا جنگل تھا دِیر میں کہ دن کے ٹائم بھی اس میں اندھیرا رہتا تھا۔ ایسا ندی کا پانی تھا کہ شیشہ کا مقابلہ کرے اور ایسا وادی اور کوہسار تھا کہ کیا مثال ہے.. پر ہم ویسا کا ویسا ہی رہا..

پھر وہاں ایک صوفی مولوی کا بڑا شہرت ہو گیا.. بڑا مشہوری بن گیا ہر طرف.. اس نے سب روڈ بلاک کر دیا.. درّہ مالاکنڈ بند کر دیا کہ یا تو شریعت ہو گا یا شہادت ہو گا.. اس سے تو یارا پورا گورنمنٹ ڈرتا تھا.. ولی اللہ تھا تو ڈرتا تھا نا.. اور

بڑاز بردست تقریر کرتا تھا.. دیر میں بھی اس کا بہت مرید تھا.. ہم بھی اس کا ایک جلسہ میں شامل ہوا تو یارا ہمارا دل بھی پگھل گیا اور ہم مومن ہو گیا..

اس جلسہ میں کسی نے پوچھا کہ مولوی صاحب ادھر پاکستان کا بھی تو فکر کرو، یہ ختم ہو گیا تو پھر ہم کیا کرے گا تو مولوی نے ایسا جواب دیا کہ سب لوگ نعرہ تکبیر بلند کرنے لگا.. اس نے کہا، ہمیں پاکستان نہیں اسلام چاہیے.. بے شک پاکستان پر ہندوستان قبضہ کر لے تو یہ اچھا ہو گا کیونکہ پھر ادھر کا پندرہ کروڑ مسلمان اس کے خلاف جہاد کرے گا تو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا.. کیا اول نمبر جواب دیا ہے یارا.. تو ہمارا دل پگھل گیا اور ہم اس کا ایک مرید کا مرید ہو گیا..

ادھر کھانا ملتا تھا، کپڑا ملتا تھا اور شہادت کی برکات پر تقریر ملتا تھا..

مولوی ہم سے کہتا تھا کہ وہ مسلمان نہیں جو طالبان کی مدد نہ کرے.. یارا ہمارے پاس تو اور کچھ تھا نہیں صرف مسلمانی تھا تو اسے ضائع نہیں کرنا تھا..

امریکہ نے جنگ شروع کیا تو مولوی نے لشکر بنایا.. کیا جذبہ تھا یارا.. اس نے دس ہزار مجاہد تیار کیا جس میں بہت ہمارے بوڑھا کی طرح کا بھی تھا لیکن باقی لوگ ہمارے موافق جوان لوگ تھا.. بھوک، پیاس اور نیند ختم ہو گیا۔ ہم دن رات ایسا نعرہ لگاتا تھا کہ گلا بیٹھ گیا.. ہمارے پاس ہتھیار تو بہت تھا مگر کم ہو گیا تو مولوی نے کہا، تم لوگ مومن ہے، تلوار سے جہاد کرے گا..

یارا میرے حصے میں ایک تلوار آیا..

ہم اس سے تربوز کاٹتا تھا اور کہتا تھا، ہم امریکی نامراد کو ایسے کاٹے گا..

لشکر کے ساتھ ہم بارڈر کے پار آیا تو طالبان لوگ نے ہمارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا یارا.. ایک وقت کھانا کھلایا اور پھر جواب دے دیا کہ ہم پہلے سے مصیبت میں ہے، تم کدھر آ گیا ہے واپس جاؤ.. ہم نے کہا، واپس نہیں جائے گا تو انہوں نے کہا، پھر ادھر تلوار نہیں چلے گا۔ اگر کچھ کرنا ہے تو یہ بندوق چلاؤ..



یارا ہم پٹھان تو تھا مگر بندوق چلانا تو دور کا بات ہے، کبھی اس کو پکڑا بھی نہیں تھا.. سب پٹھان بندوق نہیں چلا سکتا۔ صرف باہر کا لوگ یہ سمجھتا ہے.. بندوق چلانے کے لیے پیسہ چاہیے اور یارا، لید اور پیشاب صاف کرنے سے اتنا پیسہ نہیں ملتا.. تو ہم نے دو چار دن ٹریننگ کیا اور سیکھ گیا.. کچھ نے کہا، ہم تلوار سے لڑے گا..

قندوز میں ہمارا بہت لوگ شہید ہوا.. تلوار والا جتنا تھا، وہ سب شہید ہوا.. وہ نعرہ تو ایسا لگاتا تھا کہ شیر کے موافق لگتا تھا لیکن خندق سے نکلتا تو واپس خندق میں آ گرتا تھا.. مولوی اپنا بیٹا اور رشتہ دار کو ساتھ لے کر ہمیں وہاں چھوڑ کر واپس چلا گیا.. اس کے ساتھ تیس کے قریب لوگ تھے.. ہمیں کچھ نہیں بتایا اور.. چلا گیا..

یارا ہم کیا کرتا.. اوپر سے بم گرتا تھا.. ہمارے سے بہت دور گرتا تھا تو ادھر ہمارے کان اور منہ سے اور ناک سے خون نکلنے لگتا تھا۔ اتنے زور کا دھماکہ کرتا تھا.. سامنے سے اتنی گولی آتا تھا کہ ہم سر اٹھاتا تھا تو اس میں لگتا تھا.. ہم کیا کرتا.. ہم نے ہتھیار ڈال دیا..

یہ جو شمال والے ہیں.. تاجک۔ ازبک اور ہزارے ہیں، کچھ طالبان سے تو بدلہ لیتے تھے اور بیشتر کو گلے لگا کر برابر میں بٹھاتے تھے اور کہتے تھے کہ تم تو ہمارا بھائی ہو.. ہمارا ہم وطن ہو.. ہم تو ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ لڑائی جھگڑا کرتے آئے ہیں.. کبھی ہم جیت جاتے ہیں اور کبھی تم.. لیکن یہ غیر ملکی یہاں کیا کرنے آئے ہیں... ہم شائد عربوں، مصریوں، سوڈانیوں اور چی چی کو چھوڑ دیں لیکن پاکستانیوں کو نہیں چھوڑیں گے... یارا ہم تو پاکستان قربان کر کے ادھر آیا تھا، پھر بھی یہ ہمیں پاکستانی کہتے تھے..

مولوی صوفی.. یقیناً ولی اللہ تھا..

اسے اللہ کی جانب سے حکم ہوگا کہ تو اپنی اور قریبی ساتھیوں کی جان بچا کر ادھر سے نکل جا.. تیری قسمت میں ابھی شہادت نہیں ہے.. تو وہ نکل گیا.. اللہ نے حکم دیا ہوگا ورنہ وہ اتنا بزدل اور کمینہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ ہمیں بے آسرا چھوڑ کر چلا جائے.. اسے اللہ نے کسی اور جہاد کے لیے سنبھال لیا ہوگا..

میرا کیا ہوا؟

میرا یہی ہوا جو ہو رہا ہے..

کیا باہر ابھی تک چاندنی کا راج ہے..؟

دن ہے یارات..

باہر کچھ بھی ہو تہہ خانے کے اندر رات تھی.. گل شیر ولی کے دماغ میں ایک ہلکی سی دستک ہو رہی تھی.. جس میں دیر تھا اور بہت دور تھا.. زندگی کی رمق یہ دستک سنتی تھی لیکن بہری بن جاتی تھی..

گھوڑا اکڑا پڑا تھا..

اس کے مردہ گوشت کا ایک پارچہ گل شیر ولی کے معدے میں ابھی تک حل ہو جانے سے انکاری تھا لیکن اس کی موجودگی کی گرمی اس کے دماغ میں اتنی حدّت روانہ کرتی تھی کہ وہ دستک دے رہا تھا..

یارا اس مردہ گھوڑے کا رنگ وہی ہے.. دیر کے اندھیرے جنگلوں میں جو خزاں رسیدہ پتے ہولے ہولے گرتے ہیں ان کا رنگ.. اس کی پسلیاں ننگی ہو رہی ہیں لیکن اس کی پشت ابھی تک سالم ہے.. اس پر سوار ہو کر دیکھتے ہیں یارا کہ ہمارا بوڑھا کیا محسوس کرتا ہوگا جب وہ گھوڑے پر بیٹھا تھا..

گھوڑے پر بیٹھو.. گھوڑے پر بیٹھو.. دستک غالب ہو رہی تھی..

گل شیر ولی.. گھسٹتا ہوا اپنے آپ کو دھکیلتا جیسے اس کا بھائی دانے کی بھٹی کو مشقت اور مشکل سے دھکیلتا تھا.. سرد لید اور ساتھیوں کے نیم مردہ بدنوں



پر سے گھسٹتا گھوڑے کے قریب آیا.. ایک ٹانگ اٹھا کر اس پر سوار ہونے کی کوشش کی اور پھر گر گیا..

گھوڑا تو مردہ پڑا ہے یارا.. اس پر کیسے سواری کرے گا گل شیر.. ایک اور دستک ہوئی..

اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کی پتھر ہو چکی پشت کو پیار سے تھپکی دی تو اس کی تانبہ رنگت کی جلد تھرائی.. جیسے اس میں ابھی تک زندگی کی حدت موجود ہو.. پھر اس کی تھوتھنی کچھ فرش سے اٹھی اور گل شیر کے روبرو ہو گئی.. اس میں دو بے جان شیشہ آنکھیں گل شیر کی آنکھوں کے سامنے تھیں.. اس کے نیم ماؤف دماغ میں دستک کے ساتھ ایک ہلکی سی ہنہناہٹ بھی آئی۔

بے وفا جانور ہے یارا.. بے اعتبار جانور ہے.. مر جائے۔ اکڑ جائے۔ آدھا کھایا جائے، پھر بھی زندہ ہو جاتا ہے اور ہنہناتا ہے.. اس پر کیا سواری کرنی.. گل شیر کا ہاتھ گھوڑے کی پشت سے پھسل کر اس کے بقیہ بدن کی مانند ڈھیر ہو گیا..

صرف اس کے دماغ کا ایک خلیہ دستک دے رہا تھا.. بے وفا جانور ہے یارا..

دھوپ تہہ خانے میں اترتے اترتے جھجک جاتی تھی..

اس کی سفیدی میں اس خوف کی سیاہی گھلتی تھی جو تہہ خانے کے گھپ اندھیرے میں سے اوپر آ رہا تھا..

وہ نابینا سی ہو رہی تھی کیونکہ اس کی کرنوں میں قلعہ جنگی کے کچے صحن سے اٹھنے والی دھول کے ذرّے تیرتے تھے..

اوپر ہوا تیز تھی..

آج ہوا تیز تھی..

وہ لاشوں کے دریدہ دامنوں کے پھریرے لہراتی تھی اور یہ دامن بار بار اپنی ہی لاشوں پر سر پٹختے تھے۔

پہلے جب قلعہ جنگی کا یہ صحن ننگا ہوتا تھا تو تیز ہوا چلنے سے اتنی دھول اٹھتی تھی کہ دن.. رات میں بدل جاتا تھا.. مگر اب سینکڑوں اکڑے ہوئے بدن مٹی پر پڑے اسے ڈھانپتے تھے، اس لیے دھول کم اٹھتی تھی۔ صرف خون سے اکڑی ہوئی قمیضوں کے دامن ہوا میں اٹھتے تھے۔ شلواروں کے پھٹے ہوئے پائینچے ٹخنوں کے گرد پھڑپھڑاتے تھے..

دھول صرف وہاں وہاں سے اٹھتی تھی جہاں جہاں لاشوں کے درمیان کچھ وقفہ آتا تھا.. کچھ جگہ بچتی تھی.. اور صحن میں کم ہی جگہ بچی تھی.. یوں اب



دھول کم اٹھتی تھی..

جیسے ہر برس درخت کے تنے میں ایک ہالے کا اضافہ کر کے اس کی عمر متعین کرتا چلا جاتا ہے۔ ایسے ہر دن لاش کے دانتوں سے ہونٹوں کو سکیڑ کر انہیں مزید عیاں کرتا چلا جاتا ہے اور یوں یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس شخص کو مردہ ہو چکے ہوئے کتنے روز ہو چکے ہیں.. کئی لاشوں کے ہونٹ اب مزید نہیں سکڑ سکتے تھے اور ان کے مسوڑھے عیاں ہوتے تھے۔ اگرچہ وہ بھی دھول سے اٹے ہوئے ہوتے تھے.. اور بے حد مضحکہ خیز لگتے تھے.. کھلے دہن میں جو مٹی گرتی تھی، خشک رہتی تھی، نم نہ ہوتی تھی.. نمی زندگی کے ساتھ ہی رخصت ہو جاتی ہے..

لاشے دانت نکالے خوش سے لگتے تھے.. زبردستی ہنستے ہوئے.. کہیں وہ دانت نکوسے ہوئے تھے جیسے جھنجلائے ہوئے ہوں اور کہیں ایک منجمد نیم وا مسکراہٹ تھی.. وہ جو چاروں شانے چت پڑے تھے، ان کی کھوپڑیوں کے بال مٹی کے لیپ سے کانٹوں کی مانند ہو چکے تھے.. وہ بھی مٹی میں چہرہ دھنساتے ہنستے ہی ہوں گے۔

بہت دنوں سے بچّے ادھر نہیں آئے تھے..

قلعہ جنگی کی بلند سطح پر یہ ہموار میدان ان کی پسندیدہ پلے گراؤنڈ ہوا کرتا تھا.. وہ سر شام مزار شریف سے نکل کر کھیتوں کے درمیان میں سے دھومیں مچاتے، اچھلتے ٹاپتے قلعہ کے دامن میں پہنچ جاتے اور پھر سانس مجتمع کر کے اسکی ڈھلوان پر چڑھنے لگتے.. پستہ قد فصیل تک پہنچتے اور اسے پھلانگ کر صحن میں داخل ہو جاتے اور پھر اس بچّے کا انتظار کرنے لگتے جس کے پاس فٹ بال ہوتا تھا اور وہ اسے سنبھالتا پیچھے رہ جاتا تھا..

فٹ بال والا بچّہ صحن میں داخل ہوتا تو اسے سانس درست کرنے کا

موقع بھی نہ دیا جاتا اور فٹ بال شروع ہو جاتا..

البتہ ایک مسئلہ کھڑا ہو جاتا..

اور کسی کے پاس بھی اس کا حل موجود نہ تھا..

گول کیپر زیادہ ہو جاتے اور کھلاڑی کم..

اور جو گول کیپر ہوتے تھے، وہ بس گول کیپر ہی ہو سکتے تھے، یہ ان کی مجبوری تھی..

یہ فٹ بال افغان سٹائل تھا..

ہمیشہ سے یہ سٹائل نہ تھا، بس پچھلے بیس پچیس برسوں میں رواج پا گیا تھا.. ورنہ پہلے تو کھلاڑی زیادہ ہوتے تھے..

افغانی مٹی میں لاکھوں کی تعداد میں بارودی سرنگیں دفن تھیں.. انہیں بچھانے والے روسی بھی تھے اور افغانی بھی لیکن انہیں سمیٹنے والا کوئی نہ تھا..

بالغ افراد تو سنبھل کے چلتے ہیں، بچّے بے دھیان ہوتے ہیں اور کبھی اپنی جان اور اکثر اپنی ٹانگ گنوا بیٹھتے ہیں..

تو ایک ٹانگ سے محروم ایک بچّہ گول کیپر نہ ہو تو اور کیا ہو..

شائد نہیں یقیناً دنیا بھر میں سب سے زیادہ گول کیپر بچّے افغانستان میں پائے جاتے ہیں اور یہ ایک ایسا ریکارڈ ہے جس کا اندراج کہیں بھی نہیں ہوا..

یہ بچّے بھی بہت دن سے ادھر نہیں آئے تھے..

قلعہ جنگی کا صحن جو سرِ شام فٹ بال کے میدان میں بدل جاتا تھا، کچھ روز جنگی قیدیوں سے آباد ہوا اور پھر بالکل خاموش ہو گیا.. یہاں سینکڑوں لاشیں آباد ہو گئیں.. نیچے.. مزار شریف میں جو بڑے تھے، وہ تو اس آبادی سے آگاہ تھے، اس لیے جب بچّے اوپر جا کر فٹ بال کھیلنے کی ضد کرتے تو وہ انہیں سختی سے ڈانٹ ڈپٹ کر کے روک دیتے.. جان پدر او پر ارواح کا بسیرا ہے.. ان کی بدبو یہاں شہر



تک آتی ہے، اوپر نہیں جانا..

اس کے باوجود کئی روز سے اکتایا ہوا ایک بچّہ چوری چھپے ادھر آنکلا..

ارواح بھی تو ایک مقام پر قیام کرتے اکتا گئی ہوں گی اور شائد رخصت ہو گئی ہوں..

یہ فرمان اللہ کی منطق تھی.. اس لیے وہ چپکے سے گھر سے نکلا تھا، کھیتوں میں کودنے اور چھلانگیں لگانے کی بجائے جھکا جھکا چلتا قلعے کے دامن میں پہنچا تھا اور پھر سانس مجتمع کر کے اس کی ڈھلوان پر چڑھتا پستہ قد کچی فصیل تک آ گیا تھا..

اس نے بہت احتیاط سے اس فصیل پر سے صحن کے اندر جھانکا تھا..

وہاں فٹ بال کھیلنے کے لیے کوئی جگہ نہ بچی تھی..

فرمان اللہ کو یہ منظر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا..

اور اس منظر میں سے اٹھنے والی بدبو تو بالکل سمجھ میں نہیں آ رہی تھی..

وہاں تو کوئی روح نہ تھی.. لاشیں تھیں..

ایک افغان بچّے کے لیے ایک لاش کبھی بھی کسی حیرت کا موجب نہیں بنتی.. اس کے گھر کے صحن میں.. کسی کھیت میں.. سکول کے باہر.. کوئی ایک یا کئی لاشیں محض معمول تھیں..

سوائے ایک فرق کے..

گھر کے صحن میں جو لاش ہوتی تھی، وہ اپنی ہوتی تھی.. اپنی سے مراد کسی عزیز، رشتے دار یا بہن بھائی یا باپ کی.. جو دشمن کے ہاتھوں مارا گیا ہوتا تھا.. دشمن ایک نہ تھا، بدلتے رہتے تھے..

کھیتوں میں پڑی لاش لاوارث ہوتی تھی۔ کسی اور قبیلے یا کسی اور خطے سے آنے والے کی لاش اور جب اسے کتے اور گدھ نہیں کھا سکتے تھے تو اس کی بدبو سے مجبور ہو کر اسے کسی گڑھے میں دبا دیا جاتا تھا..

سکول کے باہر.. کوئی بھی لاش ہو سکتی تھی.. بالکل اپنی یا سراسر پرائی..

ہاں یہ ہے کہ اگر وہ بچہ شمال کا ہے تو پہلے روسی اسے لاشیں مہیا کر دیتے تھے، پھر طالبان نے یہ ذمہ داری سنبھال لی اور ان دنوں پتہ نہیں کون اس فرض کو سرانجام دے رہا تھا.. لاشوں کی سپلائی میں رخنہ نہیں پڑ رہا تھا.. اور اگر وہ ایک بچّہ پشتون ہے تو ان دنوں شمال والے ان کے قبرستان بھر رہے تھے.. چنانچہ ایک افغان بچّے کے لیے.. زندگی تو بن سکتی ہے موت حیرت کا موجب نہیں بن سکتی..

فرمان اللہ کو یہ منظر محض اس لیے بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ تو اِکّادُکّا یا دوچار لاشوں کا عادی تھا لیکن اس کے سامنے لاشوں کی تعداد اس کی سمجھ بوجھ اور حساب کتاب سے کہیں زیادہ تجاوز کر گئی تھی..

وہ اتنی زیادہ تعداد میں تھیں کہ انہیں دیکھ کر افسوس نہیں ہوتا تھا..

افسوس تو صرف اپنے کسی عزیز، رشتے دار کی چارپائی پر پڑی ایک لاش کو دیکھ کر ہوتا ہے لیکن لاشوں کے ایک خاموش میلے کو دیکھ کر تو نہیں ہوتا..

فرمان اللہ جب کچی فصیل کے روزن سے جھانک رہا تھا تو اس نے یہ بھی نوٹ کیا کہ اگر آج دوسرے بچّے بھی آ جاتے.. ایک فٹ بال میچ کا اہتمام ہوتا اور وہ جو فٹ بال سنبھالتا اوپر آتا تھا، وہ نہ بھی آتا تو یہاں متعدد فٹ بال میسر تھے..

اپنے دھڑ سے الگ کچھ سَر تھے جو بآسانی فٹ بال کے طور پر استعمال میں لائے جا سکتے تھے..

اگرچہ وہ اتنے مکمل فٹ بال نہ تھے کہ انہیں ٹھوکر لگانے سے وہ سیدھے سبھاؤ روانی سے لڑھکتے جاتے کہ ان کی روانی میں ان کی ناکیں آڑے آتیں اور وہ اٹک اٹک کر لڑھکتے.. اور یہ تو گول کرنے کا کوئی طریقہ نہ تھا۔ گڑھے میں پڑے.. ایک خاص زاویے پر اٹکے.. عجائب گھر میں سجے ایک مہاتما بدھ کی مانند سجے اس سَر نے لب کھولے.. فرمان اللہ سے کہا...



سرگوشی میں کچھ کہا جو کچی فصیل میں سے ایک روزن پر آنکھ جمائے فرمان اللہ تک نہ پہنچا..

تم جیسا میرا بھی ایک بیٹا تھا..

اس کا نام راہول تھا..

میں اسے سوتے میں چھوڑ آیا تھا..

تمہاری ماں مایا کو اور تمہیں سوتے میں چھوڑ آیا تھا..

میرے گھوڑے کنتھکا نے میرے قدموں پر اپنی تھوتھنی رکھ دی تھی اور میں نے اپنے شاہانہ لباس اور تاج شاہی کو اپنے سائیں کے حوالے کر کے سب آسائشوں کو تیاگ دیا تھا.. نروان کے لیے.. ایک تصور کامل کی خاطر..

نہ مجھے نروان ملا.. اور نہ وہ تصور کامل جس کی جستجو میں میں نے ہر آسائش ترک کی.. اب اس ڈیزی کٹر کے تخلیق کردہ گڑھے میں بے نام پڑا ہوں تو کیا تم میری سرگوشی سنتے ہو؟.. سب مایا ہے.. سب مایا ہے..

گڑھے میں پڑے ایک سَر کی سرگوشی کون سنتا ہے.. اس بچّے نے بھی نہ سنی.. حالانکہ وہ اُس سے مخاطب تھا..

یہ وہی صحن تھا جس میں بُزکشی کے مقابلے ہوا کرتے تھے..

بکرے کے ایک دھڑ کے حصول کے لیے مخالف گھڑسواروں کو چابکوں سے پیٹا جاتا تھا...

طالبان کو یہ کھیل ناپسند تھا..

کہ یہ شمال کی نمائندگی کرتا تھا..

اب ان کا دور اختتام کو پہنچ رہا تھا تو اب صحن میں جگہ نہ تھی..

گھوڑوں کے دوڑنے کی جگہ نہ تھی..

اگرچہ اب یہاں ایک آسانی تو میسر تھی.. کھیلنے کو دھڑ بہت تھے.. بُزکشی

کے کھیل کے لیے سر کے بغیر بکرے کا ایک دھڑ درکار ہوتا ہے جسے مخالف گھڑ سوار سے چھینا جاسکے، اس پر جھپٹا جاسکے.. لیکن مسلسل خانہ جنگی کے باعث بکرے کمیاب ہو رہے تھے تو متبادل کے طور پر ان غیر ملکی طالبان کے دھڑ بھی استعمال ہوسکتے تھے.. یہی آسانی تھی..

چنانچہ قلعہ جنگی کے کچے صحن میں کھیلوں کے سامان بہت تھے..

فٹ بال بھی اور دھڑ بھی عام ملتے تھے..

البتہ بُزکشی کے کھیل کے لیے درکار گھوڑے نہیں تھے..

صرف ایک گھوڑا تھا جو تہہ خانے کے اندھیرے میں اپنے ادھڑے ہوئے حصے پر سے پونچھ ہلا کر مکھیاں بھی نہیں اڑا سکتا تھا..

اس تہہ خانے میں اترتے اترتے.. دھوپ جھجک جاتی تھی..

اور اس کی کرنوں میں دھول کے ذرے آتے تھے کہ وہ نابینا ہو رہی تھی..

یہ گھوڑا اپنے اس انجام سے بے حد خفا تھا..

وہ کبھی بُزکشی کے مقابلوں میں سرکش ہوا کرتا تھا اور کبھی ہرات کے مصور بہزاد کے تیمور نامہ کے صفحوں پر ایک ایسے جانور کی طرح مصور ہوتا تھا جو زندہ لگتا تھا.. وہ کبھی حسینؓ کا ہوا کرتا تھا اور کبھی افلاک کی سیر کو نکلتا تھا۔ ایسے کہ اس کے سفید پر کائنات کے سفر طے کرتے تھے..

اور اب.. وہ اس تہہ خانے کی تاریکی میں ادھڑا ہوا پڑا اپنی ننگی پسلیوں پر سے مکھیاں بھی نہیں اڑا سکتا تھا۔ اس لیے وہ اپنے اس انجام سے بے حد خفا تھا..

صرف دھوپ ہی نہیں، اس کی کرنوں میں شامل قلعہ جنگی پر شوکتی ہواؤں سے اٹھتی دھول کے جو ذرے تھے، وہ بھی تہہ خانے کی سیڑھیوں سے اترتے جھجکتے تھے اور اس کے باوجود اندر کا منظر ان کی سفید نابینائی کو بھی نظر آ رہا تھا۔

اپنے انجام سے خفا ایک گھوڑے کا ڈھانچہ.. جس پر مکھیاں یلغار کرتی



تھیں.. اس کے پہلو سے لگا ایک غلیظ.. بدبودار بالوں اور بڑھی ہوئی داڑھی والا ملیشیا کی شلوار قمیض میں برہنہ پا سفید نوجوان جس کی ایڑھیاں پھٹ چکی تھیں اور انگلیوں کے ناخن ماس میں گھس چکے تھے..

اس سے پرے بھی بے حس و حرکت کچھ اجسام پڑے تھے..

ان میں سے کسی ایک کی آنکھ کھلی اور اس نے دھوپ کو سیڑھیوں پر دیکھا.. تہہ خانے میں اور تو کچھ دیکھنے کو نہ تھا نہ دکھائی دیتا تھا تو جس کی بھی آنکھ کھلتی تھی، وہ اوپر ان سیڑھیوں کو دیکھتا تھا کہ باہر دن ہے یا رات..

یہ ہاشم میر کی آنکھ تھی جو کھلی تھی اور وہ نقاہت کی دلدل میں دھنستا بمشکل بولا۔ "میرا ذہن بھٹک رہا ہے.. بھٹک کر ٹریڈ ٹاورز کی جانب جا رہا ہے اور میں جاننا چاہتا ہوں کہ ان کی جانب جو تین جیٹ ہوائی جہاز تیزی سے بڑھتے جا رہے تھے تو ان کی کیبنوں میں جو کوئی بھی انہیں ادھر لے جا رہا تھا تو جب وہ ٹاور برق رفتاری سے اس کی قریب آ رہے تھے اور وہ جانتا تھا کہ پل دو پل میں صور پھونکا جائے گا اور وہ بھی آگ میں بھسم ہو جائے گا تو اس لمحے وہ شخص کیا محسوس کر رہا ہوگا.. میں یہ جاننا چاہتا ہوں.."

ان میں سے جو اپنی آنکھ کھول سکتا تھا اور بول سکتا تھا، اس نے آنکھ کھولی اور بولا۔ "وہ مسکرا رہا تھا.."

"تم کیسے جانتے ہو؟"

"میں جانتا ہوں.. ایک امریکی گارڈ نے جب بارود سے بھرے ایک ٹرک کو بیرکوں کی جانب بڑھتے دیکھا تھا تو اس کا ڈرائیور بھی مسکرا رہا تھا.. اس قسم کے ڈرائیور ہمیشہ مسکراتے ہیں.."

"کیوں؟"

یہ "کیوں" کیا پتہ کدھر سے آیا تھا..

تہہ خانے کی اولین سیڑھیوں پر اترتی دھوپ نے.. بلکہ اسے دیکھنے سے ان میں کچھ توانائی آگئی تھی اور وہ بڑبڑانے لگے تھے.. سوائے جانی کے..

جانی بھی بڑبڑا سکتا تھا، اگر وہ گھوڑے کا ایک پارچہ نگل لیتا..

وہ اس کی سرد مردہ پشت کے ساتھ لگا جیسے ماں کی گود میں سوتا تھا..

"کیوں؟"

"اخی مجھ سے پوچھتے ہو..." عبدالوہاب بڑبڑایا..

کہیں سے کوئی جواب نہ آیا صرف بڑبڑاہٹ سنائی دی..

"نہ پوچھو تب بھی جواب دیتا ہوں کہ کیوں.."



میں آلِ سعود میں سے ہوں..

خادمینِ حرمین شریفین میں سے ہوں..

اگرچہ مجھے ان کی خادمیت کی اجازت نہ تھی۔

اس لیے کہ میرے بھیجے میں اور طرح کی سوچیں وار کرتی تھیں.. وہ صرف حرمین کے خادم نہ تھے۔ "سفید گھر" کے بھی خادم تھے... میں بڑا بول نہیں بول رہا، تکبر نہیں کر رہا لیکن میں تم سب سے زیادہ پڑھا لکھا ہوں.. میں نے کیمبرج سے علم الانسان کی ڈگری نمایاں پوزیشن میں حاصل کی تھی... میرے پروفیسر یقین نہ کر سکتے تھے کہ عام طور پر ایک سعودی اوّل تو کیمبرج کے کسی کالج میں داخل ہونے کے تعلیمی معیار پر پورا نہ اترتا تھا اور اگر وہ داخل ہو جاتا تھا تو اسے مزید تعلیم سے کوئی شغف نہ ہوتا تھا.. مزید عورتوں، مزید شراب اور مزید کاروں سے شغف ہوتا تھا۔ اس لیے میرے پروفیسر میرے سعودی نژاد ہونے پر شک کرتے تھے، اگرچہ میں تھا.. لیکن اس اعلیٰ تعلیم نے مجھے کوئی راستہ نہ سجھایا، کوئی راہ نہ دکھائی اور مجھے احساس ہوا کہ یہ سب علم اور آگہی محض سراب ہے.. جیسے نجد میں سراب ہوتے ہیں.. میں اپنی ذات کے اونٹ کو اپنے علم اور آگہی کے چابک سے پیٹتا چاہے کتنی ہی تیز رفتاری سے سفر کیوں نہ کروں، مجھے کچھ حاصل نہ ہوگا.. میں کبھی بھی اس تالاب تک نہ پہنچ پاؤں گا جو میری پیاس بجھا سکے.. میرا

حلق ان کھجوروں کے ذائقے سے کبھی آشنا نہ ہو گا جن کی مٹھاس کے لیے میں ترستا ہوں..

میرا باپ جس نے میرے ایسے درجنوں بچّوں کا بیج مختلف بیویوں میں ڈالا اور وہ کبھی کبھار ہمارے نام بھول جاتا تھا اور اپنے خادم سے پوچھتا تھا کہ یہ جو بیس برس کا ہے، اس کا کیا نام رکھا تھا.. آل سعود کے خادموں میں سے تھا.. بلکہ اب بھی ہے..

وہ ہر برس دو ماہ کے لیے جرمنی جاتا تھا..

اسے دنیا بھر کی قومیتوں میں سے صرف جرمن عورتوں کے بھرے بھرے بدن شہوت سے بے اختیار کرتے تھے...

اس کا پسندیدہ شہر ہیمبرگ تھا اور پسندیدہ علاقہ ریپا بہان..

وہ وہاں زناکاری کے لیے ہرگز نہیں جاتا تھا بلکہ عین شرع کی حدود میں جاتا تھا کہ وہ نہایت متقی اور پرہیزگار تھا.. اب بھی ہے۔

جرمنی کے سفر کے دوران اس کے دو خصوصی خادم یا معاون ہوتے تھے.. بہت پڑھے لکھے اور مقامی رسوم و رواج اور زبان میں طاق.. یعنی جرمنی کے رسوم و رواج اور زبان اور ان کی تنخواہیں کسی آئینی بادشاہ یا ملکہ سے بھی کہیں زیادہ ہوتی تھیں۔

وہ ہیمبرگ کی گلیوں اور بازاروں میں گشت کرتے.. فٹ پاتھوں پر چلنے والی آفس گرلز.. گھریلو عورتوں.. سٹورز میں شاپنگ کرتی ہوئی لڑکیوں.. یونیورسٹی کی طالبات.. سڑکوں پر سے کوڑا اٹھانے والی خواتین.. غرض کہ ہر مادہ کو عقاب کی آنکھوں سے دیکھتے.. کہ ان کی آنکھوں میں عورت کے بدن کی پیمائش کا وہ پیمانہ لگا ہوتا تھا جو میرے باپ کی جنسی طلب کے معیار پر پورا اترتا تھا... ان خادموں کو عین معلوم ہوتا تھا کہ اس کی چھاتیوں کا سائز کیا ہونا چاہیے.. اس کے



کولہوں پر کتنا گوشت درکار ہے اور اس کا دہن کتنا فراخ ہونا مصلحت کے مطابق ہے.. وہ کبھی بھی شکل و صورت کو نہیں پرکھتے تھے کہ اسے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ وہ صرف گلیوں، بازاروں اور ریستورانوں میں ہی ایسے گوہرِ نایاب کو تلاش نہیں کرتے تھے بلکہ نائٹ کلبوں اور قحبہ خانوں میں بھی جو خواتین ہوتی تھیں، انہیں بھی ناپتے تھے.. اور جونہی کوئی عورت اس معیار پر پوری اترتی تھی.. وہ اپنے بانڈ سٹریٹ کے سوٹ کا کالر درست کرتے.. پیئر کارڈن کی ٹائی کی گرہ سنبھالتے ایک نہایت تہذیب یافتہ لہجے میں اسے ایک پیشکش کر دیتے...

نائٹ کلبوں، قحبہ خانوں اور کسینوز میں تو انہیں کچھ زیادہ دقت کا سامنا نہ کرنا پڑتا کہ وہاں چارجز طے شدہ ہوتے تھے۔ البتہ گلیوں، بازاروں اور سکولوں وغیرہ میں جو لڑکیاں پیمانے پر اتر آتیں، انہیں مائل کرنے میں قدرے دشواری ہوتی..

فراؤلائن آپ کی شخصیت انتہائی متاثر کُن ہے اور حُسن اس لائق ہے کہ آپ صرف ایک شب کے لیے ہمارے شیخ کی ذاتی مہمان بن جائیں.. وہ آپ کی دعوت کرنا چاہتے ہیں.. آپ کی تواضع کرنے کے متمنی ہیں اور.. اگلی صبح شکرانے کے طور پر اتنے ہزار ڈالر آپ کی نذر کریں گے..

بہت کم ایسا ہوا کہ یہ پیشکش ٹھکرا دی گئی ہو.. کیونکہ ایک عام آفس گرل.. ایک سیلز گرل یہاں تک کہ ایک گھریلو خاتون بھی اتنی بڑی رقم کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتی اور وہ بھی ایک رات کے عوض میں.. یورپی خواتین کے لیے جنسی رفاقت ایک معمولی بات ہوتی ہے.. اگرچہ وہ اپنی ذاتی پسند سے چناؤ کرتی ہیں لیکن ایسی معمولی بات کے لیے اگر دو تین برس کی تنخواہ کے برابر رقم ملنے کی پیشکش ہو جائے تو یہ اتنی بڑی کشش ہوتی ہے کہ وہ اس کے سامنے ٹھہر نہیں سکتیں۔ ایک شب کے لیے ذاتی پسند کو تیاگ دینے میں کیا مضائقہ ہے.. وہ اتنی رقم

سے ایک فلیٹ خرید سکتی تھیں اور بقیہ زندگی آسائش میں بسر کر سکتی تھیں۔ چنانچہ انکار کا امکان بہت کم ہوتا تھا..

صرف ایک بار انکار ہوا تھا..

صرف ایک مرتبہ ان دو خادموں کو ناکامی ہوئی تھی (وہ تقریباً میری عمر کے ہیں اور میرے دوست ہیں اور جرمنی سے واپسی پر کہانیاں سنا دیتے ہیں)..

ایک معمولی سی لڑکی نے انکار کر دیا تھا..

اور وہ اتنی معمولی تھی کہ پبلک ٹائلٹس میں جرمن شرابیوں کے فرش پر گرنے والے پیشاب کو ایک برش سے صاف کرتی تھی..

وہ اس معیار پر پوری اتر گئی..

اتنے عامیانہ اور غلیظ کام کرنے والی ایک لڑکی تو پیشکش کرنے سے پہلے ہی پیشکش قبول کر لے گی بلکہ شکر گزار ہو گی..

اور جب پیشکش کی گئی تو واقعی وہ بے حد خوش ہوئی اور ہنس کر کہنے لگی کہ آپ لوگوں نے مجھے پسند کر کے ایک بہت بڑا اعزاز دیا ہے ورنہ جرمن لڑکے تو مجھے فربہ اور بھدی گردانتے ہیں اور آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے.. لیکن میں یہ نہیں کر سکتی..

خادموں نے نذرانے کی رقم دوگنی کر دی تو وہ پھر بھی ہنستی رہی کہ نہیں..

اور خیال رہے کہ وہ اتنی رقم چند برسوں میں تو کیا پوری زندگی میں نہیں کما سکتی تھی.. پبلک ٹائلٹس میں صفائیاں کرتے، بول و براز کی بُو میں سانس لیتے دن رات کرتے ساری عمر بسر کر کے پھر بھی وہ اتنی بڑی رقم.. صرف ایک شب میں حاصل نہیں کر سکتی تھی اور پھر بھی اس نے کہا کہ... نہیں!

خادموں کو ایسی معمولی مہترانی اور ان پڑھ سی لڑکی سے ایسے جواب کی ہرگز توقع نہ تھی اور انہیں اپنے کانوں پر اس "نہیں" کا اعتبار نہ آیا تو انہوں نے



پوچھا کہ کیوں نہیں..

"اس لیے.. کہ" مہترانی نے جرمن شرابیوں کے پیشاب پر برش چلاتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں طوائف نہیں.. بدن بیچنے والی نہیں.. میں کام کرتی ہوں اور روزی کماتی ہوں، اب تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

خادموں کو شدید حیرت ہوئی کہ کفر کے اس معاشرے میں بھی رزق حلال کا کانسپٹ موجود ہے..

میرا باپ شرع کا پابند تھا..

ہر سعودی کی مانند عادتاً نماز کا پابند تھا..

کوئی روزہ قضا نہیں کرتا تھا..

دونوں خادم کبھی بھی خالی ہاتھ نہ لوٹتے.. ناپ تول پر پوری اترنے والی جو بھی لڑکی ساتھ لاتے تو میرا باپ.. شیخ.. اس کے اعزاز میں ہیمبرگ کے گراں ترین ہوٹل کے پورے فلور پر ایک وسیع دستر خوان بچھا دیتا.. کھانے کے اختتام پر باقاعدہ اس کے ساتھ نکاح پڑھواتا.. اور اگلی صبح... طلاق طلاق طلاق..

میں نے بتایا ہے ناں کہ وہ شرع کی سختی سے پابندی کرتا تھا..

کیمبرج کے قیام نے مجھے بہت بدل دیا تھا..

ایک سخت گیر بادشاہت کے ہر مُہرے کے سامنے مُہر بہ لب رہنا اور اس کے سامنے جھکتے چلے جانا میرے لیے دشوار ہوتا گیا..

اس بادشاہت میں اگرچہ قانون کی سختی مثالی تھی لیکن اس سختی کے سامنے جب کوئی امریکی یا یورپی آتا تھا تو وہ موم ہو جاتی تھی..

ان غیر ملکیوں کی موجودگی اور ان کی قانون سے برتری میری عزت نفس کو مجروح کرتی تھی..

وطن ہمارا تھا لیکن حکمرانی ان کی تھی.. فوجی اڈے ان کے تھے جن کے

اندر سعودی جنرل بھی نہیں جاسکتے تھے..

پھر یہاں افغانستان میں روسیوں کی حماقت کا آغاز ہو گیا.. ہزاروں عرب ادھر آنکلے اور القائدہ کے اسیر ہوئے.. میں بھی ان میں سے ایک تھا.. ان دنوں امریکہ اور پورا یورپ ہماری پیٹھ تھپکتا تھا.. ہمیں مجاہدین کہا جاتا تھا اور ہماری جھولیاں ڈالروں اور ہتھیاروں سے بھر دی جاتی تھیں.. یہی امریکہ مسلمان ملکوں کے نوجوانوں کو مقدّس جہاد کے لیے ابھارتا تھا، بھرتی کرتا تھا، ٹریننگ دیتا تھا اور یہاں بھیج دیتا تھا.. تمہیں پتہ ہے کہ ادھر القائدہ کے جتنے بھی کیمپ ہیں اور تورا بورا اور گردیز میں غاروں کا جو وسیع جال ہے، یہ سب امریکہ کے زیر نگرانی وجود میں آئے۔ ہم ان کے ہیرو تھے۔ ان کا بڑا ہیرو ریمبو بھی ہمارے شانہ بشانہ لڑتا تھا.. لیکن جونہی "بدی کی سلطنت" کا خاتمہ ہوا تو وہ ہاتھ جھاڑ کر نکل گئے کہ ان کا مقصد پورا ہو چکا تھا.. ہم وہی مجاہدین اور ہیرو تھے جو 11 ستمبر کے بعد دہشت گرد اور بدترین مجرم بن گئے... پہلے یہ جہاد تھا کیونکہ روس مقابل میں تھا اور اب یہ قابل گردن زدنی ہے کیونکہ ہم اپنا دفاع کر رہے ہیں.. مجھے معلوم ہے کہ شمال والے ہمیں کبھی نہیں بخشیں گے کیونکہ ہم نے طالبان کا ساتھ دیا ہے۔ شائد یہی ہماری غلطی تھی.. ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا لیکن ہمارے لیے اور کوئی جائے پناہ نہ تھی.. بادشاہت میں ہم قدم نہیں رکھ سکتے تھے کہ اس قدم کو.. پہلے قدم کو کاٹ دیا جاتا اور ہمارا بقیہ دھڑ بعد میں گرتا.. ہم کدھر جاتے.. طالبان کو سپورٹ کرنا ہماری مجبوری تھی..

اگر علم اور آگہی سراب تھے.. صحرائے نجد کی مانند تو یہ جہاد بھی ایک سراب تھا.

جانی کی آنکھ بھی کھلی اور ذروں بھری دھوپ کو تیسری سیڑھی پر دیکھا..

اس نے سنا کہ عبدالوہاب کچھ بڑبڑا رہا ہے.. اگر علم اور آگہی سراب تھے.. صحرائے نجد



کی مانند تو یہ جہاد بھی سراب تھا۔

اوپر قلعہ جنگی کے صحن میں سورج سر پر آگیا تھا۔

دوپہر ہو چکی تھی..

یہ کوئی ایسا لمحہ تھا جب تہہ خانے میں سب مکین آنکھیں کھول رہے تھے.. اور سب کی آنکھیں ذرّوں بھری دھوپ پر تھیں..

مرتضیٰ بیگ گھسٹتا ہوا گھوڑے کے ڈھانچہ کے قریب ہوا.. ناتوانی سے خنجر کو گرفت میں لیا اور ڈھانچے کے اور قریب ہوا۔

جان کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ "میرے براؤنی کو مت مارو۔"

"یہ مر چکا ہے جانی.. اس کی پسلیوں کے ننگے پن کو جو مکھیاں ڈھانپتی ہیں، وہ بتاتی ہیں کہ یہ مر چکا ہے.. ہمیں مزید گوشت کی توانائی کی حاجت ہے.. کچھ دیر اور زندہ رہنے کے لیے ہمیں اس کے پارچے نگلنے ہیں۔"

"ہم کیوں زندہ رہنا چاہتے ہیں بیگ..؟"

"زندہ رہنے کے لیے ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں جانی.. ہتھیار نہ ڈالنے کے لیے۔ قید میں نہ آنے کے لیے.."

"بیگ ہمارے ساتھیوں نے مزاحمت کیوں نہیں کی.. ہر شہر میں لڑے بغیر ہتھیار ڈالتے گئے یا پسپا ہو گئے.. کسی ایک مقام پر جم کر مقابلہ نہیں کیا.. کیوں؟"

"سنو جانی.. میں پاکستانی ہوں.. انہوں نے پورا ایک ماہ امریکیوں کی حشر بمباری کی تباہی اور آگ سہی ہے.. اپنے سٹینڈ سے ذرہ بھر منحرف نہیں ہوئے.. پورے ایک ماہ تک دنیا کی سب سے بڑی قوت کے سامنے کھڑے رہے ہیں، سرنگوں نہیں ہوئے.. میرے لیے ایک پاکستانی کے لیے یہی بہت ہے.. کیونکہ میرے ملک کی تاریخ میں صرف چند روزہ جنگ کے بعد ایک معمولی دشمن کے

سامنے ہمارے نوّے ہزار سپاہیوں نے ہتھیار رکھ دیئے تھے اور جان کی امان چاہی تھی.. ان میں وہ میجر بھی تھا جو میرا باپ تھا.. بعد میں یہی ہتھیار ڈالنے والے جنرل ہمارے حکمران ہوئے اور پھر اپنی کرسی کو مستحکم کرنے کی خاطر روسیوں کے خلاف جہاد میں شریک ہو کر عظیم مجاہد کہلائے.. تو میرے لیے یہ بھی بہت ہے۔ ان کے جاہل ملا عمر نے کم از کم اپنا پستول مسکراتے ہوئے ان کے حوالے نہیں کیا.. تم سمجھ رہے ہو؟"

یہ نہیں کہ وہ دونوں اسی تسلسل اور روانی سے گفتگو کر رہے تھے.. نہیں.. وہ کبھی نڈھال ہو کر اوندھے ہو جاتے.. کبھی کھانسنے لگتے اور کبھی تا دیر چپ رہ کر اپنے بکھرتے سانس سنبھالتے۔

تہہ خانے کے روپوشوں کی آنکھیں کھل چکی تھیں..

انہوں نے گھوڑے کے جو پارچے نگلے تھے، ان کی عطا کردہ قلیل توانائی رخصت ہو چکی تھی اور بھوک ان کو پھر سے لاغر کرتی تھی..

گھوڑے کے ڈھانچے پر براجمان کچھ مکھیاں بور ہو کر اب ان کے غلیظ اور بدبودار بدنوں پر بیٹھ رہی تھیں لیکن ان کا ماس مردہ تھا، وہ محسوس نہیں کر پاتے تھے کہ اس پر مکھیاں بیٹھ رہی ہیں۔

بیگ نے بہت کوشش کی لیکن خنجر کی دھار گھوڑے کے جمے ہوئے خون سے کند ہو چکی تھی اور وہ پارچے تراشنے میں ناکام ہو رہا تھا..

"پاکستانی.." جانی نے گھوڑے کے گرد بانہیں لپیٹ رکھی تھیں۔ "پلیز اسے اذیّت مت دو.. اسے کچھ مت کہو.. یہ میری ماں ہے.. اسے نہیں کاٹو.."

بیگ اپنے نیم مردہ بازو میں سکت بھرتا خنجر پر گرفت مضبوط کرتا گوشت کاٹ لینے کی سعی کرتا رہا.. مسلسل دانت بھینچے کوشش کرتا رہا..

یکدم جانی نے ایک کرب آمیز آہ بھری۔ "یہ میرا بازو ہے بیگ.. جسے تم



کاٹنے لگے تھے.."

بیگ خوفزدہ ہو کر فوراً تھم گیا.. رک گیا۔ "کیا میں نے واقعی تمہیں زخمی کر دیا ہے؟"

"پتہ نہیں، مجھے کچھ محسوس نہیں ہو رہا.. لیکن میں نے دھار کو محسوس کر لیا تھا۔"

"سوری جانی.. لیکن تم اپنے بازو پرے کیوں نہیں کر لیتے؟"

"مجھ میں ہمت نہیں ہے.. وہ گھوڑے کے بدن کے ساتھ جیسے چپک گئے ہیں.."

بیگ نے خنجر رکھ کر اس کے دونوں بازوؤں کو ڈھانچے سے جدا کیا، انہیں اٹھایا.. وہ اسے بہت بھاری لگے اور اس کے سینے پر رکھ کر پھر سے اپنی جستجو میں محو ہو گیا..

"اس قیامت کی تاریکی میں کوئی دروازہ ہے؟" چی چی جہاں بھی تھا، وہاں سے اس کی نقاہت سے اکھڑتی آواز آئی..

ہاشم میر نے سرد گوبر کے کیچڑ میں ایک اذیت ناک کروٹ لی۔ اسے کچھ دیر برداشت کیا اور پھر بولا۔ "جہاں تیسری سیڑھی پر دھوپ ہے وہاں دروازہ ہے.. اس تہہ خانے کا.. کیوں تم باہر جا کر ہتھیار ڈالنا چاہتے ہو؟"

"ہتھیار؟" نہ صرف چی چی یکدم چوکنا ہوا بلکہ باقی سب بھی سناٹے میں آ گئے۔ "وہ کہاں ہیں؟"

"بھائی جی.." اللہ بخش اب کہیں جا کر بولا تھا۔ "وہ ساری بندوقیں شندوقیں یہیں کہیں ہیں.. کون کیا ہیں؟"

"کون کیا ہیں؟" چی چی میں چیخنے کی قوت آ گئی۔ "اگر وہ تیسری سیڑھی سے نیچے آتے ہیں تو ہمیں دفاع کرنا ہے۔"

"کس کا دفاع کرنا ہے چی چی؟"

"اپنے تصور کا.."

"ویسے ان طالبان بے وقوفوں نے بامیان کے بُدھا کیوں تباہ کر دیئے تھے؟"

"مت بھولو کہ ہم خود بھی طالبان کہلاتے ہیں۔" بیگ گھوڑے کے پارچے تراشنے کی کوشش میں جتا ہوا بولا۔ "انہوں نے گولہ باری کر کے ان بتوں کو اس لیے پاش پاش کر دیا کہ وہ متروک خدا تھے.. ان علاقوں میں کبھی اس بدھا خدا کی حکمرانی چلتی تھی... پرستش ہوتی تھی.. متروک خداؤں پر ترس کھانا چاہیے اور انہیں ملیامیٹ کر دینا چاہیے۔"

"لیکن بیگ.." یہ عبدالوہاب تھا۔ "یہ جو محمود تھا غزنی کا.. جسے ہم بت شکن کہتے ہیں تو اس نے انہیں کیوں نہیں چھیڑا؟"

"یارا وہ جانتا تھا کہ ان کے اندر دولت مولت نہیں ہے۔" گل شیر ولی نے جواز پیش کیا۔ "ایسا بُت توڑنے سے فائدہ جس میں کچھ ہیرا جواہر نہ ہو۔"

"تو پھر.. انہوں نے ایسا کیوں کیا..؟"

"کس نے کہا تھا کہ طالبان میں بے وقوفی بہت ہے.. تو وہ ہے۔"

"اور کس نے کہا تھا کہ وہ متروک خدا تھے؟"

"میں نے.." بیگ نے فوراً جواب دیا۔

"بیگ.. کیا زمانے بدلنے.. وقت کے گزرنے سے خدا بھی متروک ہوتے جاتے ہیں؟"

"ہاں.."

"تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ ہمارا آج کا خدا آج سے دو ہزار برس بعد متروک ہو جائے اور ان زمانوں کے لوگ اس کے تصور کو مسمار کر دیں؟"



"لاحول ولا.." عبدالوہاب بڑبڑایا.. اور پھر فوراً مسکرایا..

"کیا یہ ممکن ہے بیگ؟"

"تم کفر بک رہا ہے یارا.. ہمارا رب ہمیشہ کے لیے ہے.."

"بدھ کے پجاری بھی جب بامیان کے مجسّموں کے سامنے سر جھکاتے تھے تو یہی یقین رکھتے تھے کہ یہ ہمیشہ کے لیے ہے.."

"وہ تو راہ راست سے بھٹکے ہوئے کافر تھے، پر میں گارنٹی کرتا ہوں یارا کہ ہمارا رب ہمیشہ کے لیے ہے.. یہ کبھی متروک نہیں ہو گا روز حشر تک.."

"کیا گارنٹی ہے؟"

"اوئے یہ کون ہے جو اللہ میاں کے لیے گارنٹی مانگ رہا ہے؟" اللہ بخش غضبناک ہو گیا..

"میں تو نہیں تھا.."

"میں بھی نہیں تھا.."

"تو پھر کون تھا؟"

"کوئی بھی نہیں تھا.."

کچھ دیر خاموشی رہی.. بیگ اپنی کاوش میں مشغول رہا..

"تمہیں پتہ ہے کہ اس کی آنکھیں نیلی تھیں.. بلو سفائر کی طرح.."

جانی اس بحث سے لاتعلق کہیں اور تھا.. یہ نہ جانتے ہوئے کہ بیگ اس کے بازوؤں کو گھوڑے کے ڈھانچے سے الگ کر کے اس کے سینے پر رکھ چکا ہے۔ یہ نہ جانتے ہوئے بھی بولا۔ "اور ان میں ایک وحشی جانور والی کشش تھی.... اور وہ مجھے نہیں ملی.. میں نے اسے بہت تلاش کیا۔ لیکن وہ مجھے ملتی تو بھی میں اسے کیسے جان سکتا تھا.. وہ ایک برقعے میں روپوش ہوتی.."

"لو جی امریکی نے بھی عاشقی معشوقی کی بات شروع کر دی ہے۔" اللہ

بخش بے حد خوش ہوا۔ "آخر کو ہم لوگوں کا بھی تو دل ہوتا ہے بھائی جی.."

"واللہ تم پر نثار ہونے کو جی چاہتا ہے امریکی.. اتنے دنوں بعد پہلی بار عورت کا ذکر آیا ہے.. ہم خوشبو اور نماز کا تو ذکر کرتے رہے اور تیسری پسندیدہ شے.. عورت کو فراموش کر گئے.. کون تھی؟"

"عربی.. مجھے کیا پتہ، وہ کون تھی.. میں نے تو صرف اس کی تصویر دیکھی ہے۔ نیشنل جیوگرافک میں.. اس کی تصویر سرورق پر شائع ہوئی تو اس کے وحشی نیلے حسن نے امریکہ بھر میں تہلکہ مچادیا.. اور ہم سب اس پر عاشق ہو گئے.. وہ ایک افغان ریفیوجی لڑکی تھی جسے کسی پاکستانی کیمپ میں شوٹ کیا گیا تھا.. جس فوٹو گرافر نے اسے شوٹ کیا، وہ صرف اس ایک تصویر کی وجہ سے ایک بین الاقوامی شخصیت بن گیا.. بہت سے تھے اور بہت امیر تھے جو اس سے شادی کرنا چاہتے تھے.. کچھ اسے اڈاپٹ کرنا چاہتے تھے لیکن وہ تو لاکھوں مہاجرین میں سے ایک بے آسرا اور بھوکی لڑکی تھی.. ہم جس کو اس کی آنکھوں کی وحشی نیلاہٹ سمجھتے تھے، وہ دراصل اس کی بھوک تھی.. شائد وہ مر چکی ہو.. شائد اس کی شادی ہو چکی ہو لیکن میں جب افغانستان آیا تو مسلسل اس کو تلاش کرتا رہا.. کہیں وہ نظر آجائے.. وہ نہیں ملی۔"

"تم اس کے لیے مسلمان ہوئے تھے؟"

"لاحول ولا..." جانی شرمندہ ہو کر مزید مردنی اور نقاہت میں اتر گیا۔

"لیکن وہ میرے حواس پر چھائی رہتی ہے۔"

"اور مجھے میرے سوال کا جواب نہیں ملا۔ میں نے پوچھا تھا کہ اس قیامت کی تاریکی میں کوئی دروازہ ہے..؟" چی چی پکارا۔

"اور میں نے کہا تھا کہ تیسری سیڑھی پر دھوپ ہے۔ اس کے آگے دروازہ ہے۔ تم نے سنا نہیں.. لیکن تم کیوں پوچھتے ہو بار بار؟"



"کسی داغستانی سیانے نے کہا تھا کہ میں اس آدمی کی طرح ہوں جو اندھیرے میں کوئی دروازہ تلاش کر رہا ہے یا اس دروازے تک پہنچ گیا ہے لیکن یقین کے ساتھ یہ طے نہیں کر پا رہا کہ کیا اس کے اندر جانا ممکن بھی ہے یا نہیں.. اور جانے سے کوئی فائدہ بھی ہو گا یا نہیں.. اور اس دوران دروازے پر دستک بھی دیئے جا رہا ہوں.. تھپ تھپ تھپ.."

"ایسا کوئی دروازہ نہیں چی چی.. اگر کوئی ہے تو وہ صرف موت پر کھلتا ہے۔"

بالآخر کُند خنجر کی مسلسل رگڑ سے بیگ نے چند پارچے کاٹ لیے تھے.. گوشت اکڑا ہوا اور لکڑی کی مانند سخت تھا۔ "ان کو نگل لو.." وہ ایک اپاہج کی طرح جو کہ وہ تھا، گھسٹتا ہوا ہر ایک کے قریب ہو کر اس کے منہ کے سامنے گوشت کا ایک لوتھڑا معلق کر کے کہتا تھا اور لجاجت سے کہتا تھا۔ "اسے پلیز نگل لو۔"

اگرچہ اس نے جانی کو یہ پیشکش نہیں کی تھی لیکن اس نے سینے پر رکھے ہاتھ اٹھائے اور گھوڑے کے بچے کھچے ڈھانچے کے گرد حمائل کر دیئے۔ "میں گھوڑے کو نہیں کھاؤں گا.. یہ ماں ہے.."

"چی چی.. ہو چی چی.."

"ہاں پاکستانی.."

"مر تو نہیں گیا.."

"ابھی نہیں.."

"چی چی آج کیسا دن چڑھا ہے کہ مجھ میں طاقت سی آ گئی ہے.. جی کرتا ہے باتیں کرتا جاؤں، کرتا جاؤں.. اپنے اندر جتنی باتیں ہیں کر جاؤں.. لو چی چی میں نے ناں عادت کے مطابق کہہ دیا کہ آج کیسا دن چڑھا ہے.. اس تہہ خانے میں تو دن رات برابر ہیں.. سیڑھیوں پر دھوپ ہے تو دن ہو گا اور نہیں تو رات ہے.. پر اب رات ہو گئی ہے، میں جانتا ہوں.. دھوپ تیسری سیڑھی تک تو اتری تھی، پھر اٹھی اور روٹھ کر واپس چلی گئی۔ اس کی جگہ رات اتر آئی۔ یار چی چی رات کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کونسی سیڑھی پر اتر چکی ہے.. یہ تو یارا اندر واندر جُثّے میں اترتی ہے اور گھپ اندھیرا کر دیتی ہے.."

"اللہ بخش واقعی تم میں بولنے کی ہمت آ گئی ہے... کتنا گھوڑا کھایا تھا؟"

"نہیں چی چی، دین ایمان کی قسم، ایک بوٹی نگلی تھی۔ پر وہ بھی یوں باہر آئی ہے جیسے کسی تہہ خانے میں اترنے سے گھبراتی ہو.. پر مجھ میں آج بہت ہمّت آ گئی ہے.. میرا جُثہ کورے گھڑے کی طرح نواں نکور اور ستھرا محسوس ہوتا ہے۔



پتہ نہیں کیوں.. اوئے چی چی مرجانیاں تیرا مُلخ ہے کدھر ہے اور تو آ کدھر گیا ہے.."

"تم مجھے چی چی اس لیے کہتے ہو ناں کہ میں چیچنیا کا رہنے والا ہوں.."

"آہو.. ہمارے مولوی صاحب جب دعا مانگتے تھے ناں تو ہمیشہ کہتے تھے، یا اللہ کفار کو برباد کر دے.. طاغوتی طاقتوں کا ستیاناس کر دے اور ہم اپنی ٹنڈیں جو دھریک کے دھرکونوں کی طرح ہوتی تھیں، ہلا ہلا کر جھوم جھوم کے کہتے تھے۔ "آمین آمین" حالانکہ ہمیں کچھ پتہ نہ تھا کہ یہ طاغوتی طاقتیں کیا بلا ہیں.. پھر وہ دعا مانگتے تھے یا اللہ کشمیر، فلسطین اور چی چی نیا کو آزادی عطا فرما اور ہم بلند آواز میں "آمین آمین" کہتے تھے۔ حالانکہ ہمیں یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ یہ چی چی نیا ہے کہاں اور ہے کیا؟ ملک ہے یا کوئی بندہ ہے.. ویسے چی چی اللہ تعالیٰ سے دل کی گہرائی سے صاف پاک نیت سے جو دعا مانگی جائے تو وہ ہر صورت قبول ہوتی ہے ناں؟"

"کبھی ہوتی ہے کبھی نہیں ہوتی.. دعاؤں سے آزادی مل جاتی تو اب تک مل چکی ہوتی.. گھر بیٹھے کچھ نہیں ملتا.. جہاد کے بغیر آزادی نصیب نہیں ہوتی۔"

"ہمیں تو جہاد کے ساتھ بھی کچھ نہیں ملا چی چی.. ہم سے ہمارے پنڈ کے ڈنگر اچھے ہیں، انہیں دانہ پانی اور چارہ ملتا ہے.. ان کی صفائی ستھرائی ہوتی ہے۔ جہاں بیٹھتے ہیں تو ان کا گوبر صاف کیا جاتا ہے.. اور یہاں ہم اس اُوترے نکھترے گھوڑے کی لید میں پڑے ہیں.. پر یہ تمہارا چی چی نیا ہے کہاں؟"

"بتایا تو تھا.."

"آج پھر بتاؤ.."

جانی کی حالت بہت خراب تھی..

مرتضیٰ بار بار اس کے گالوں کو تھپکتا تھا اور اسے ان میں حرارت کا ایک شائبہ بھی محسوس نہیں ہوتا تھا لیکن جب کبھی وہ اس کے گھوڑے کے گرد لپٹے

بازو الگ کرنے کی کوشش کرتا تو وہ تھوڑا سا بڑبڑاتا تھا اور گرفت سخت کر دیتا تھا.. تو وہ زندہ تھا، سانس چل رہا تھا..

"چیچنیا کہاں ہے؟.. وہاں جہاں میری دادی نفیسہ خاتون نے خواب میں امام شامل کو دیکھا تھا.. یہ کبھی ایک جگہ نہیں رہا.. آگے پیچھے ہوتا رہتا ہے.. زمین تو وہی رہتی ہے۔ اس پر بسنے والے کبھی رخصت ہوتے، کبھی لوٹتے ہیں.. ہم ہمیشہ سے عقاب رہے ہیں اپنی ہواؤں میں پرواز کرنے والے.. لیکن روسی ہمیں شورش پسند کہتے تھے.. ان کے سٹالن نے ہماری آدھی سے زیادہ آبادی کو زبردستی بے گھر کر کے دوسری ریاستوں میں بکھیر دیا.. ہمیں ہمارے چولہوں سے الگ کر کے ایسے علاقوں میں بھیج دیا جہاں اتنی سردی تھی کہ چولہے جلتے ہی نہیں تھے.. ہم جہاں کہیں بھی تھے.. جارجیا، سائبیریا یا یوکرین میں تو ہم اپنی زمین اور گھاس کی مہک کو ساتھ لے کر گئے۔ اپنے مذہب کو اپنی روایات کو فراموش نہیں کیا.. اپنے وطن کو یاد کرتے رہے اور ہر رات مغرب کی نماز کے بعد واپسی کی دعائیں کرتے رہے.. اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ چیچنیا کہاں ہے اور کیسا ہے.. اتنے برس ہو گئے ہیں گھر سے نکلے.."

"چی چی.." اللہ بخش میں آج ہمت تھی، وہ گھسٹنے کی بجائے بڑی آسانی سے رینگتا ہوا اس کے قریب ہو گیا۔ "مجھے بھی ناں بڑے سال ہو گئے ہیں گھر سے نکلے.. یار ہم گھر واپس جائیں گے.."

"نہیں اللہ بخش.. ہم گھر تو کیا سورج کی روشنی میں بھی کبھی نہیں جائیں گے.. گھر جانے کے لیے ہی تو ہم نے شمالیوں کے آگے ہتھیار رکھ دیئے تھے.. پشتون بھائیوں نے ہی ہمیں تسلی دی تھی کہ اب جنگ ختم ہو گئی ہے، جہاد کا وقت نہیں.. ہتھیار رکھ دو اور اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ.. اس کے بعد جو ہوا تھا، وہ تم جانتے ہو.."



"مجھے تو ابھی تک نہیں پتہ کہ کیا ہوا تھا.. ہوش آیا ہے تو یہ تہہ خانہ تھا.. کیا ہوا تھا؟"

"کیا پتہ.. یاد نہیں وہ ہمیں اوپر قلعہ جنگی کے احاطے میں لے آئے تھے کہ بس یہاں تمہاری تصویریں اتاریں گے.. کہاں سے آئے ہو، کیا نام ہے، یہ سب کچھ درج کر کے تمہیں چھوڑ دیں گے.. پھر بغاوت ہو گئی.. اللہ کو علم ہے کہ ہم کیسے بغاوت کر سکتے تھے.. دو چار عرب ایسے تھے جن کی شلواروں میں کچھ ہتھیار اور گرنیڈ تھے.. ان پر ستم ہوا تو انہوں نے چلا دیئے تو شمال والے غصے میں آ گئے.."

"آہو یار.. کوئی خرگوشوں کو بھی ایسے نہیں مارتا جیسے انہوں نے ہمارا خون خرابہ کیا.. ٹینکوں سے گولے چلائے.. راکٹ پھینکے اور کبھی دیواروں کی اوٹ سے ہم پر گولیوں کی بارش کر دی... ہم سب تو نہتے تھے.. کئیوں کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے.. خرگوشوں کی طرح اچھلنے اور بھاگنے لگے.. پر خرگوش تو پھر اپنے سوراخوں میں گھس جاتے ہیں، ہم کہاں گھستے.. لیکن چی چی ہم جتنے بھی تھے.. ہزار کے آس پاس تو ہوں گے، ہم میں پشتون بڑے تھوڑے تھے.. یہ گل شیر تو ہمارے والا پشتون ہے ناں.. سب ہمارے جیسے پردیسی تھے اور ہم نے ہاتھ کھڑے کر کے اللہ رسول کے واسطے دیئے کہ ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں۔ پر انہوں نے تو فیصلہ کر لیا تھا ناں.. پھر اوپر سے امریکی جہاز آ گئے.. یار چی چی تم کیسے اس تہہ خانے میں آئے تھے؟"

"میں سب سے آخر میں آیا تھا.."

"سب سے پہلے کون آیا تھا..؟"

"پتہ نہیں.."

"میں آیا تھا.." کہیں کوئی بولا..

"کون.."

"میں عبدالحمید جان واکر... میں آیا تھا.."

"کیسے جانی کیسے.." مرتضیٰ کھل گیا کہ وہ بولنے کے قابل ہو رہا ہے۔

"بتاؤ جانی، تم کیسے آئے تھے؟"

"میں.." جانی بڑبڑانے لگا لیکن گھوڑے پر اپنے بازوؤں کی گرفت ڈھیلی کیے بغیر جیسے اسی کو سنا رہا ہو۔ "جب بی-52 کے کلسٹر بم اترے اور پہلے بہت اوپر فضا میں پھٹے اور پھر ان میں سے سینکڑوں چھوٹے چھوٹے بم ایک گلاس جتنے ہم پر برسنے لگے اور ہمارے پرخچے اڑنے لگے.. میرے بدن پر اتنے لوتھڑے.. دوسروں کے لوتھڑے چپکے ہوئے تھے کہ ان سے ایک اور بدن بنایا جا سکتا تھا.. جانے کس کس کے اور کون کون سے اعضاء اڑتے ہوئے میرے جسم کے ساتھ آ لگے تھے.. اور وہ ابھی تک گرم تھے تو میں پہلے تو موت اور پاگل پن کے سناٹے اور قہر میں آیا ہوا قلعہ جنگی کے صحن سے فرار ہونے کی بجائے وہیں کھڑا منہ اٹھا کر اپنے ہم وطنوں کو گالیاں دینے لگا.. یو بلڈی راسکلز... یو سن آف بچز.. لیکن وہ بہت ہی بلندی پر تھے۔ ان تک میری گالیاں کہاں پہنچ سکتی تھیں.. ویسے وہ سن لیتے تو حیران بہت ہوتے کہ یہ نیچے شلواروں اور پگڑیوں کی جو بھگدڑ مچی ہے، ان میں سے ایسی امریکی گالیاں کون دے سکتا ہے.. پھر ایک چھوٹا بم میرے قریب پھٹا... میری ناک میں سے خون بہنے لگا اور اس کی کرچیاں میری ٹانگوں میں چھید کر گئیں اور میں لنگڑاتا ہوا بھاگنے لگا.. فصیل کی جانب.. اور ادھر شمالیوں کی گولیاں اور راکٹ تھے اور اوپر وہ باسٹرڈ تھے.. تب مجھے صحن میں ایک شگاف سا نظر آیا اور وہاں سیڑھیاں تھیں.. ان تک میں بہت دشواری سے پہنچا کہ میرے اوپر دھڑا دھڑ خون آلود پرخچے بوجھ بن کر گر رہے تھے.. تو میں پہلا تھا.. جب یہاں کوئی نہیں تھا تو میں تھا.."



"تمہارے بعد میں اترا تھا.." عبدالوہاب کی آواز اگرچہ مدھم تھی لیکن تہہ خانے میں گونجتی آئی۔ "اترا تو نہیں.. میں ان سیڑھیوں کے آس پاس کہیں تھا تو ایک گولی یا بم کا ٹکڑا میری پسلیوں میں آ لگا اور میں لڑھکتا ہوا نیچے یہاں آ گیا.. مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کہاں آ گرا ہوں.. لیکن جب میں نے اپنے آپ کو سنبھال کر آس پاس دیکھا ہے تو جانی تم.. ایک کونے میں سمٹے ہوئے بیٹھے تھے اور میں تمہاری گوری رنگت اور سنہری بال دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا کہ امریکی یہاں بھی آ گئے ہیں.." وہاب کے معدے میں گھوڑے کے گوشت نے اتنی حدت پیدا کر دی تھی کہ اب وہ نہایت فصاحت اور بلاغت کا مظاہرہ کرنے کے موڈ میں تھا لیکن چی چی نے اسے مزید موقع نہ دیا۔ اندھیرے میں جیسے اعلان کیا۔ "پھر کون آیا تھا؟ امریکی اور عربی کے بعد پھر کون آیا تھا.."

"میں؟"

"کون میں؟"

اندھیرے میں کیا پتہ کہ یہ "میں" کہاں سے آیا تھا.. وہاب دیدے پھاڑ پھاڑ کر تاریکی میں تعین کرنے لگا..

"میں.. مرتضیٰ بیگ.."

"یہ میرے قریب ہے.. میں جانتا ہوں۔" جانی تقریباً ہنسا۔ "یہ بار بار میرے گالوں کو ہاتھ لگا کر دیکھتا تھا کہ میں زندہ ہوں یا نہیں اور میرے بازو گھوڑے سے الگ کرتا تھا.. اس لیے میں جانتا ہوں کہ یہ میرے قریب ہے.. بتاؤ بیگ.."

"میں ایک فوجی کا بیٹا ہوں اور جنگ کی اس حکمت عملی سے واقف ہوں کہ تم جہاں کہیں بھی ہو، اپنی پوزیشن کا تعین کر کے فرار کے راستے کا بھی تعین کر لو.. جب وہ ہمیں مزار شریف سے ایک ریوڑ کی صورت میں ہانکتے ادھر قلعہ جنگی

کے احاطے میں لے آئے تھے تو میں نے یہاں داخل ہوتے ہی یہ دیکھ لیا تھا کہ وسیع کچے صحن کے مغربی کونے میں چند کوٹھڑیاں ہیں اور ان کے فرش کے برابر میں کچھ سیڑھیاں نیچے جا رہی ہیں.. جب شمال والے ہمیں بھون رہے تھے اور جب پہلے ڈیزی کٹر نے صحن میں ایک آتش فشاں کی مانند گڑھا بنایا تو میں اندھا دھند ان سیڑھیوں کی طرف بھاگا.. لیکن اس سے پیشتر میں نے ایک زخمی کے شکنجے میں کسی ہوئی کلاشنکوف کھینچی اور اسے فائر کرتا ہوا یہاں اتر آیا.. پہلے تو گھپ اندھیرا تھا اور پھر یکدم مجھے دو ہیولے دکھائی دیئے اور میں انہیں شوٹ کرنے کو تھا کہ میں نے سنا کہ ان میں سے ایک... کلمہ پڑھ رہا تھا تو میں رک گیا۔"

"ہاں.." وہاب بولا۔"میں نے سمجھا کہ کوئی شمالی میرے تعاقب میں ادھر آنکلا ہے اور مجھے شوٹ کرنے کو ہے تو میں کلمہ پڑھنے لگا"

"ان کے بعد میرا نمبر آتا ہے۔" اللہ بخش چہکنے لگا.. اور اس کی آواز میں نہ نقاہت تھی اور نہ لرزش۔ "آہو.. میرے اوپر تو اتنے بندے مرمر کے گرے کہ میں ان میں دب گیا.. اگر وہ مکمل طور پر لاشیں ہوتے تو میں کبھی ان میں سے باہر نہ آسکتا.. پر وہ ابھی تڑپتے اور پھڑکتے تھے اور آگے پیچھے ہوتے تھے تو مجھے ان میں سے نکلنے کی گنجائش مل گئی.. گھسٹتا ہوا نکلا ہوں تو آگے یہ سیڑھیاں تھیں، میں بھی اترا نہیں.. دھڑام کر کے اندر گر گیا.. میں نے نہیں دیکھا کہ اندر کوئی اور بھی ہے.. میں تو گرا ہوں ناں تو بس ہوش میں نہیں رہا.."

"تو پہلے.. امریکی.. پھر عربی.. اور تیسرا پاکستانی.. اس کے بعد؟"

"تم گنتی کر رہے ہو چی چی.. ڈائری لکھ رہے ہو.. حساب کتاب کر رہے ہو؟" ہاشم میر غضب میں آگیا۔ اس کی اردو میں برطانوی انگریزی کا لہجہ گہرا تھا۔

"کیا فرق پڑتا ہے کہ یہاں کون کب آیا تھا.."

"اخی.. یہ تو زندہ رہنے کے لیے ایک مشق ہے.. باتیں کرتے جانا۔"



وہاب بہت ہی نرمی اور دھیرج سے بولا۔ جیسے ایک بچے کو سمجھاتے ہیں۔"چپ ہو گئے تو گئے.."

"تو بس ان کے بعد میں آیا ہوں یارا.." ڈیرہ والا ذرا دیر کر کے بولا کیونکہ وہ ہاشم کی ڈانٹ سے ڈر گیا تھا۔"مجھے تو حرام ہے کہ کچھ یاد پڑتا ہو کہ میں کیسے اور کب اس خانہ خراب اندھیرے میں آیا ہوں... جب وہ دن گزرا ہے.. اور اوپر خاموشی چھا گیا ہے تو تب مجھے پتہ چلا کہ ادھر تو اور لوگ بھی ہے.. بہت پناہ گزین ہے.. آپ قسم لے لو، پر میرے کو کچھ معلوم نہیں، کچھ یاد نہیں کہ ادھر کیسے آپڑا ہوں.. بس زندگی باقی تھا تو ادھر گرا ہوں.. یارا ہاشم درست بات کرتا ہے کہ ہم نے گنتی تو نہیں کرنا کہ کون کب آیا تھا.. کیا فرق پڑتا ہے.."

"تو اور کیا بات کریں؟" وہاب نے قدرے ناراضگی سے کہا..

"یہ بات کرو کہ یارا تم لوگ نے کبھی ہمارا ریاست دیر کا مالٹا کھایا ہے؟ آج بہت یاد آتا ہے۔"

"اوئے خان صاحب.. ادھر تمہارے ہاں تو نسوار وغیرہ چلتا ہے، یہ مالٹا کدھر سے آگیا؟"

"تم جانتا نہیں ناں.. جہاد کے لیے ادھر تو آگیا ہے پر اپنے وطن کو نہیں جانتا.. یارا دیر میں بہت پیاز ہوتا ہے اور مالٹا ہوتا ہے اور اتنا شیریں ہوتا ہے کہ... ادھر اس خانہ خراب گھوڑا کا ماس کھا کھا کر جگر میں گرمی پیدا ہو گیا ہے، اتنا ہو گیا ہے اپنا مالٹا کا رس یاد آتا ہے کہ کیسے حلق تر کرتا تھا.."

"تم نے کبھی سرگودھے کا کنّوں نہیں کھایا ناں خاں صاحب.." اللہ بخش لہک کر بولا۔"نہ کبھی مکئی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ کھایا ہے....."

"یارا مکئی تو ہمارے علاقے میں بہت ہوتا ہے، اور پنجاب سے بہتر ہوتا ہے.. پنجاب کا مکئی تو جانور بھی نہیں کھاتا اور ساگ پات بھی بھیڑ بکری کے لیے

ہوتا ہے۔ تم گوشت موشت کی بات کرو ہم سے۔۔"

"لو بھائی جی یہ ہماری مکئی کو برا کہہ رہا ہے... چلو مان لیا کہ پہاڑوں میں مکئی ذرا میٹھی ہوتی ہے، پر ہمارے گنّے کا کوئی جواب ہے تمہارے پاس؟"

"یارا تم نے مردان کا گنّا نہیں کھایا ناں... تمہارا گنّا بھی ڈھور ڈنگر کا خوراک ہے۔۔"

مرتضٰی بیگ باقاعدہ ہنسنے لگا۔ "یہ تم لوگ کن چکروں میں پڑ گئے ہو... ویسے مجھ سے بھی تو کوئی پوچھو کہ مجھے کیا یاد آتا ہے..."

"بتاؤ یارا تم بھی بتاؤ..."

"مجھے میکڈانلڈ کا زنگر برگر اور آئس کریم یاد آتی ہے۔۔ آئس کریم... واقعی گھوڑے کا گوشت جہاں بدن کو گرم کرتا ہے وہاں خشکی بھی پیدا کرتا ہے تو اس کریمی آئس کریم کے دو چمچے اس وقت مل جائیں ناں..."

"امریکیوں کے خلاف ہو لیکن ان کی خوراک کی تعریف کرتے ہو۔۔"

وہاب نے کہیں سے آواز دی۔ "ہاشم تمہیں بھی کچھ یاد آتا ہے... ہاشم۔"

ہاشم نے کروٹ بدلی... اپنا کان ادھر کیا جدھر سے یہ آوازیں آ رہی تھیں... مسلسل اس کے کانوں میں اتر رہی تھیں اور وہ بھی ہنسا۔ "بریڈ فورڈ کی سرد راتوں میں فش اینڈ چپس کھانے کا بھی اپنا لطف ہے... لیکن ماں کے ہاتھوں کے باریک گرم گرم پھلکے اور گھنے تہہ دار پراٹھے... کبھی قیمے کے.... کبھی مولی کے..."

"گھوڑے کے قیمے کے؟"

خاموشی ہو گئی...

اندھیرا اگر مزید گھنا ہو سکتا تھا تو ہو گیا... وہ اس تہہ خانے میں کہیں اور چلے گئے تھے، پھر سے واپس آ گئے... لمحۂ موجود کی حقیقت میں... اس کی قطعیت



اور اس کا آخری پن اُن پر غالب آ گیا۔۔ لمحۂ موجود کی قطعیت کے آخر میں ایک اذیت ناک انجام اور یقینی موت کے سوا اور کچھ نہ تھا... ان سب کی زبانوں پر اس لیے تالے پڑ گئے تھے کہ وہ انجام بالکل قریب آ چکا تھا...

جھیل بندِ امیر کے پانی اتنے بلوریں اتنے شفاف اتنے نیلگوں تھے کہ جب ایک محاذ سے واپسی پر عبدالوہاب نے ایک ٹیلے کو عبور کرتے ہوئے انہیں یکدم اپنے سامنے پایا تو وہ گنگ رہ گیا تھا۔ یقین نہ کر سکا کہ دنیا میں ایسے پانیوں کا وجود بھی ممکن ہے... ہر عرب میں دوسری قوموں کی نسبت پانی کی پیاس زیادہ ہوتی ہے... ان کا ایک مذہبی المیہ بھی پانی سے ہی جنم لیتا تھا۔۔ بندِ امیر جھیل ایک ناقابلِ فہم سراب تھی۔ اگرچہ حقیقت تھی۔۔ خشک ویرانیوں میں گھرا ہوا نیلاہٹ کا ایک جزیرہ۔

عبدالوہاب اس میں تیر رہا تھا۔۔

جھیل کی تہہ کی ریت کا ایک ایک ذرّہ اسے دکھائی دے رہا تھا... پانی اتنے شفاف تھے۔۔ مزار شریف کے راستے میں جھیل بندِ امیر ایک سیّال نگینہ تھی۔۔ اس کی کل وسعت میں صرف ایک بدن تھا جو اس میں تیرتا اور ابھرتا تھا۔۔ اس کے ساتھی پریشان تھے کہ وہ اتنی بے اختیاری سے اس کے پانیوں میں کیوں کود گیا تھا۔۔ وہ اس کی پیاس سے ناواقف تھے۔۔ کنارے سے اسے آوازیں دیتے تھے کہ ادھر شمال والے ہو سکتے ہیں۔۔ خطرناک علاقہ ہے، ادھر سے نکل چلو... لیکن وہاب کے لیے ان نیلگوں پانیوں میں ہونا ایک جنت سے کم نہ تھا۔۔ ایک متوقع جنت سے یہ جنت کہیں افضل تھی جو اس فانی بدن کے ایک ایک مسام کو ٹھنڈک اور نیلاہٹ سے بھرتی تھی۔۔

عبدالوہاب اس میں تیر رہا تھا لیکن جھیل کے کنارے خالی ہو چکے تھے۔۔

اس کے ساتھی جا چکے تھے.. اسے تنہا چھوڑ کر چلے گئے تھے..

وہ ڈبکی لگا کر پانیوں کے اندر جو نیلا آسمان تھا، اس میں تیر رہا تھا.. یہاں کوئی آواز نہ تھی.. کلاشنکوف کی کانوں کے پردے کٹ کٹ کاٹنے والی آواز.. کوئی دھماکہ نہ تھا.. ڈیزی کٹر اور کلسٹر بم کے زہریلے گرم آہنی ٹکڑے نہ تھے.. ایک نیلی خاموشی تھی اور کیمبرج کا "مے بال" تھا.. ماہ مئی میں منعقد کیا جانے والا سالانہ رقص.. اور جینیفر تھی.. وہاب تم ناچتے تو بہت اچھا ہو لیکن بار بار میرے پنجوں پر پاؤں رکھ دیتے ہو ایک اونٹ کی طرح... اس لیے جینیفر کہ میں ایک اونٹ ہوں جو تمہارے عشق میں دیوانہ ہو کر بے اختیار ہو گیا ہوں اور بلبلاتا ہوں.. تمہاری نیلی آئرش آنکھوں میں جو نخلستان ہیں، ان کے چشموں سے اپنی پیاس بجھانا چاہتا ہوں.. ہم عربوں میں پیاس بہت ہوتی ہے..

"مے بال" کی اگلی سویر کی گہری دھند میں کیمبرج کے دریا میں اس کی کشتی دھیرے دھیرے سرکتی آگے ہوتی تھی.. وہ تیزی سے چپّو چلا کر یکدم آگے ہوتا اور سامنے بیٹھی جینیفر اس کے قریب ہو جاتی اور اس کے لب گیلے کر دیتی..

جھیل بند امیر جینیفر کی نیلی آنکھ تھی جس میں وہ تیرتا تھا..

"بھائی جی.. کچھ تو بولو.. آج میرا دل کرتا ہے بولنے کو.." جب سب لوگ خاموشی میں چلے گئے اور ایک طویل مدت سناٹے میں کٹ گئی تو اللہ بخش نے کہا..

"میں.." وہاب کی آنکھوں کے سامنے گھپ اندھیرا تھا.. جینیفر نہ تھی.. نہ نیلی آنکھیں اور نہ جھیل بندِ امیر کے پانی.. "میں پانیوں میں تھا.."

"اچھا.." اللہ بخش نے حیرت سے کہا.. "پر کیوں؟"

"مجھے پانی پسند ہیں۔"

"مجھے بھی.." اللہ بخش نے موقع غنیمت جانا اور پھر بولنے لگا۔ "لو جی



مجھے بھی پانی بڑا پسند ہے.. چوہدری ثناء اللہ کے کنویں میں سے سویرے سویرے... اور سردیوں کی سویرے اولو میں سے جو پانی گرتا ہے ناں اور میں اس کے نیچے بیٹھ کر... چوہدری کی اجازت سے نیچے بیٹھتا تھا تو وہ کیا پانی ہوتے تھے، عربی.. سردیوں میں جب کھیت کُکّر سے سفید ہوتے تھے، برف سفید تو اس پانی میں سے بھاپ اٹھتی تھی اور وہ بدن کو ٹکور کرتا تھا.. ایک سویرے.. میں وہاں نہاتا تھا جب میں نے زینب کو پہلی بار دیکھا تھا.."

"زینب.." وہاب چونکا۔ "کیا مقدّس نام لیا ہے تم نے پاکستانی.."

"نہ جی.. زینب تو ڈنگروں کی کوٹھڑی میں سے گوبر جمع کرنے کے لیے آتی تھی اور پھر سارا دن اُپلے تھاپتی رہتی تھی.. اسے پہلی بار دیکھا تھا.."

"پھر کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں.." اللہ بخش نے بھولپن سے کہا۔ "پھر کچھ بھی نہیں.."

"میرا خیال تھا کہ تم کسی سچی محبت کی کہانی سنانا چاہتے ہو.." چی چی بولا..

"اس نے میری طرف دیکھا ہی نہیں.. دیکھتی تو شائد کچھ کام بن جاتا.. اوئے چی چی تمہیں کچھ یاد نہیں آتا.."

"مجھے؟.. مجھے اپنے آسمان یاد آتے ہیں جہاں کوّے نہیں عقاب پرواز کرتے ہیں.. وہ گھر یاد آتے ہیں جہاں سے سرِ شام دھواں اٹھتا ہے تو ان آبشاروں تک جاتا ہے جو بلندیوں سے بوچھاڑ کرتے چٹانوں میں گھرے تالابوں میں گرتے ہیں.. ہر بلندی کی آغوش میں ایک ایسی جھیل روپوش ہے جس میں کوئی دوشیزہ بے خطر بے لباس تیر سکتی ہے اور میں ان سب کو ترک کر کے افغانستان کے بے آب و گیاہ ویرانوں اور حسن جمال سے یکسر عاری لوگوں کی مدد کے لیے آ گیا ہوں.."

"کیا تم پچھتا رہے ہو؟"

"نہیں.. میں تو گروزنی کا احسان چکانے آیا ہوں.. لیکن میں نے بہت

کچھ ترک کیا ہے.. جانی اور ہاشم میر کی طرح آسائشیں تو نہیں البتہ ڈھیر سارا حسن ترک کیا ہے.. آسائشیں حاصل کی جاسکتی ہیں حُسن نہیں..''

''جانی نے تو نیلی آنکھوں والی خانہ بدوش لڑکی کے لیے سب کچھ ترک کیا ہے.. کیوں جانی...'' مرتضٰی نے اسے چھیڑا کہ شائد وہ بولنے لگے..

جانی کے مردہ بازوؤں میں ہلکی سی.. ایک خفیف سی حرکت ہوئی.. اگرچہ وہ سب اس اندھیرے میں اس خفیف سی حرکت سے آگاہ نہیں ہو سکتے تھے لیکن جانی گھوڑے کو آغوش میں لیے ہوئے اس کی مردہ جلد پر ناک رکھے اس سے مخاطب ہوا۔ ''نہیں میں نے وہ سب کچھ صرف اپنے آپ کے لیے ترک کیا.. اپنے تصوّر کامل کے لیے..''

''یارا ہم اپنے دیر کے مالٹے چھوڑ آئے..''

''چپ کراوئے خان.. میرے ہاں تو چھوڑنے کو کچھ تھا ہی نہیں، پر پھر بھی.... سردیوں میں بھی کنوئیں کا جو نیم گرم پانی بھاپ دیتا تھا اسے... اور زینب جس نے میری طرف دیکھا ہی نہیں تھا، اسے تو چھوڑ آیا ہوں ناں.. اور اپنے قبرستان کو چھوڑ آیا ہوں..''

''کیا فرق پڑتا ہے کہ انسان کہاں دفن ہوتا ہے.. دفن ہوتا ہے یا بے گور و کفن قلعہ جنگی کے صحن میں پڑا رہتا ہے اور گدھوں اور کتّوں کی خوراک بنتا ہے..'' ہاشم میر نے تلخی سے کہا.. وہ اللہ بخش کی جہالت سے تنگ آچکا تھا... ''فرق تو پڑتا ہے ناں میر صاحب.. اپنے قبرستان میں تمہارے اردگرد تمہارے بزرگ اور تمہارے پیارے تمہارا خیال رکھتے ہیں۔ تم اکیلے نہیں ہوتے اور جمعرات کے جمعرات تمہاری قبر پر کوئی نہ کوئی آکر کلام پاک پڑھتا ہے اور دیا جلاتا ہے..''

''یارا اللہ بخش تم مرنے والے بنو.. دیا میں جلادوں گا، یہ وعدہ رہا..''

''بھائی جی ہم نے ناں مر بھی جانا ہے..'' اللہ بخش کو دکھ ہوا کہ اس میں



آج سب سے بڑھ کر ہمت تھی اور کوئی اس سے باتیں نہیں کرتا تھا۔ وہ دکھ میں چپ ہو گیا...

رات کی وہ تاریکی مزید گہری ہو گئی..

سبھی چپ ہو گئے..

نیند سے یا نقاہت سے.. چپ ہو گئے اور تاریکی مزید گہری ہو گئی..

ساعتیں خاموش اور تہہ خانے کے اندھیرے میں بے نام گزرتی گئیں..

''صبح ہو گئی ہے۔'' کسی نے سرگوشی کی۔ ''تیسری سیڑھی پر روشنی ہو رہی ہے.. بہت مدھم سی.. عجیب رنگ کی روشنی اتر رہی ہے..''

''صبح نہیں ہوئی..'' بیگ میں یہ ہمت تھی کہ وہ بلند آواز میں بول سکتا۔ ''میں سویا نہیں.. جاگ رہا ہوں۔ وہاں تیسری سیڑھی پر دھوپ نہیں چاندنی ہے جو بہت مدھم ہے..''

جو خاموش اور اندھیرے میں بے نام ساعتیں بے شمار گزری تھیں، ان کے بعد چی چی نے اللہ بخش کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''پاکستانی، دیکھو... چاندنی تیسری سیڑھی پر سے اتر رہی ہے۔ ابھی ہم تک آجائے گی اور ہمارا سینہ روشن کر دے گی.. دیکھو..''

اللہ بخش کیا دیکھتا.. اس کی آنکھیں مردہ ہو چکی تھیں..

اتنا سرد ہو چکا تھا کہ اس کا ریزہ ریزہ بدن اب جُڑ چکا تھا اور اکڑ چکا تھا..

آنکھیں مردہ ہو کر ڈھیلی ہو کر ڈھلک چکی تھیں..

چاندنی تیسری سیڑھی سے آگے نہ ہوئی... کہ آگے اس تہہ خانے میں موت کی پہلی سردی تھی..

وہ بے شک خود مرنے والے تھے.. ان کے زخم ناسور بن کر انہیں خود بُو دے رہے تھے.. ان کی اپنی غلاظت جو تہہ خانے کے ایک کونے میں ڈھیر تھی، اس کی بُو سے انہیں ابکائیاں آ رہی تھیں۔ ان کے جُثے ایک تیز رفتار رتھ کے نیچے کچلے جانے والے بدن کی مانند سسکتے اور خون بھرے تھے۔ اگرچہ یہ جما ہوا پپڑیوں والا چپکیلا خون تھا لیکن ان کے لیے بھی جو بے شک خود مرنے والے تھے، وہ بُو برداشت سے باہر ہو رہی تھی جو تہہ خانے کی سیڑھیوں سے اتر کر ہوا کو گھنی کرتی ان کی ناکوں اور حلق میں اترتی تھی..

ایک کتّا، ایک مویشی کہیں مرا پڑا ہو تو میلوں تک اس ہوا میں سانس لینے والے منہ پر رومال رکھ لیتے ہیں۔ چادر کا پلّو ناک پر رکھ لیتے ہیں۔ قلعہ جنگی کے صحن میں کئی دن سے سینکڑوں انسان مرے پڑے تھے اور یہاں جانور انسان سے کہیں برتر ہو جاتا ہے کہ مرے ہوئے جانور میں سے وہ متلی آور بساند نہیں آتی جو انسانی لاش کے گلتے سڑتے رگ وریشے میں سے اٹھتی ہے.. شائد اس لیے کہ جانور کی لاش کا گلنا سڑنا قدرتی نظام کے عین مطابق ہے جبکہ انسانی لاش مرنے کے کچھ دیر بعد ہی اپنی بُو سے خبردار کرتی ہے کہ مجھے فوراً دفن کر دو.. جلا دو.. بہا دو.. اور جب ایسا نہیں کیا جاتا تو اس کی بدبُو احتجاج کرتی ہے کہ میں یوں کھلی فضا میں گلنے سڑنے کے لیے نہیں، قدرت نے جو طریقے طے کئے ہیں، ان



کے مطابق میرے ساتھ سلوک کرو..

قلعہ جنگی کے صحن میں پڑی سینکڑوں لاشیں یہی احتجاج کر رہی تھیں..

مزار شریف کی جانب سے اس لیے بھی کوئی بھی کئی دن سے ادھر نہیں آیا تھا کہ انسانی فنا کا یہ احتجاج وہاں تک جاتا تھا.. اور مزار کے گرد طواف کرنے والے منہ پر رومال رکھنے پر مجبور ہو جاتے تھے..

یہ بُو شہر کے گھروں میں تھی.. ان کے بستروں اور تکیوں میں سرائت کر چکی تھی اور وہ رات کو مشکل سے سوتے تھے..

صرف بلخ کے شکستہ وجود میں وہ آتش پرست بوڑھا آہورا مزدا کی مقدّس آگ کے سامنے اطمینان سے بیٹھا تھا کہ آگ بُو کو جلاتی جاتی تھی..

بُو کا واحد منبع قلعہ جنگی کی گلتی سڑتی لاشیں نہ تھیں، ان کے اُدھڑے ہوئے بدن اور گھوڑے کا ڈھانچہ ہی نہیں تھا بلکہ ان کی اپنی غلاظت بھی تھی.. ایک کونے میں جہاں وہ فارغ ہوتے تھے، وہاں ایک ڈھیر لگا تھا جو رِستا رِستا تہہ خانے کے فرش پر پھیل چکا تھا اور اس کی بُو اس بند قبر میں کئی دنوں سے ٹھہری ہوئی تھی.. یہ غلاظت گھوڑے کی لید میں شامل ہو چکی تھی تو وہ اگر فرش پر نیم مردہ پڑے تھے تو صرف لید میں ہی نہیں اپنے بول و براز میں بھی لِتھڑے ہوئے تھے..

بُو کا تازہ ترین مأخذ ایک اور بھی تھا.. اللہ بخش کی لاش...

اس کے مردہ اعضاء ڈھیلے پڑ کر اپنے اندر جو کچھ تھا، اسے خارج کر چکے تھے..

اتنی اور ایسی اور اس قسم کی بُو کسی بھی انسان کی فہم میں نہیں آسکتی..

صرف ایک مردے کی بُو تو فہم میں آسکتی ہے کہ ہر ایک کو کہیں نہ کہیں یا اپنے گھر میں کبھی نہ کبھی یہ تجربہ ہو جاتا ہے.. لیکن دھوپ میں پڑی سینکڑوں کٹی پھٹی لاشوں

میں سے اٹھنے والا تعفّن.. پھر اپنے ہی بدن کی مُردنی کی بُو... اپنے ہی بول و براز میں لِتھڑا ہونا.. اور ایک ساتھی کی خراب ہوتی لاش.. یہ سب کسی بھی انسان کے فہم میں کیسے آسکتا ہے۔ جب تک کہ اس نے خود قلعہ جنگی کے اس تہہ خانے میں بھوک اور نقاہت میں سانس نہ لیا ہو..

چی چی نے کسی فرد سے مخاطب ہو کر نہیں تہہ خانے کی تاریکی اور بُو سے روہانسا ہو کر کہا۔ "یہ تو مجھ سے باتیں کرتا تھا.. مجھ سے کہتا تھا، تیرا اُلغ کہاں ہے.. شائد آج اسی لیے اس میں ہمت آگئی تھی کہ اس نے مر جانا تھا.. اسی لیے اتنی باتیں کر رہا تھا.. لیکن یہ کیسے چپ ہو گیا.. یکدم مر گیا.. باتیں کر رہا تھا، چُپ کیسے ہو گیا۔"

"جیسے اوپر جو پڑے ہیں، وہ مر گئے چی چی.." ہاشم نے ابھی ابھی ایک پارچہ نگلنے کی سعی کی تھی اور وہ مسلسل ابکائیاں لے رہا تھا۔ "وہ بھی تو باتیں کرتے تھے.. تمہارا کیا خیال ہے، وہ گونگے تھے.. باتیں کرنے والے ہی تو مرتے ہیں.. جو چپ رہتے ہیں، وہ کب مرتے ہیں.."

"مجھ سے کہتا تھا سرگودھا کا کنّوں دیر کا مالٹا سے اچھا ہوتا ہے۔"

"آپ سب چپ ہو جاؤ.." وہاب کی آواز تھی۔ "ہم تو ابھی اس مردہ گھوڑے کو کھاتے ہیں، پر اُسے اللہ بخش کو اس کا پاک صاف رزق مل رہا ہو گا.. اسے مُردہ نہ کہو۔"

چاندنی جانے کس ساعت لوٹ گئی تھی، پھر سویر ہوئی تھی اور پھر دھوپ تیسری سیڑھی پر پھیلنے لگی تھی..

اس کائنات کے، اس دن رات کے عجیب واہمے اور دستور ہیں.. ایک موت کے منتظر بیمار کے لیے دن کا وقت.. جب روشنی ہوتی ہے اتنا ہولناک نہیں



ہوتا جتنی کہ رات.. بیشتر موتیں شام ڈھلے یا رات کے سمے ہوتی ہیں.. تاریکی موت کی معاون ثابت ہوتی ہے.. انسانی بدن کے اندر کچھ نہ کچھ بُجھ جاتا ہے اور موت غالب آجاتی ہے..

چنانچہ جو روشنی دکھائی دے رہی تھی جس کی دھوپ میں ذرّے تیرتے تھے، وہ ان کو بے شک چند لمحوں کے لیے ہی سہی، زندگی کے قریب کرتی تھی.. وہ جہاں کہیں تھے، اپنی بدنی حالت کو کروٹ میں بدلنے کی سعی کرتے تھے۔

"مجھے اب بھی لگتا ہے کہ وہ بولنے لگے گا.. ہم بھی تو بہت دیر مردہ رہنے کے بعد بولنے لگتے ہیں.. اس اندھیرے میں وہ دکھائی تو نہیں دے رہا، صرف مجھے اس سمت کی پہچان ہے جدھر سے اس کی آواز آیا کرتی تھی اور وہ سمت بہت دیر سے چپ ہے.. ہو سکتا ہے وہ زندہ ہو.."

"نہیں.." مرتضیٰ بیگ کی آواز بھی تھک رہی تھی۔ "تمہیں اس سمت سے آنے والے فضلے کی بُو سے جان لینا چاہیے کہ وہ مر چکا ہے.. یاد ہے ہم قندوز میں اپنے مرچکے ساتھیوں کی پہچان اسی طرح کرتے تھے۔"

"اس کو دفن کرنا ہے یارا.. لاش کا بے حرمتی ہوتا ہے پڑے پڑے.."

اس نے مرنے سے پہلے سب سے زیادہ باتیں گل شیر ولی سے کی تھیں اور وہ اپنے آپ کو اس کی موت کا ذمہ دار سمجھتا تھا..

"اوپر صحن میں جو سینکڑوں بے حرمتی ہو رہا ہے، اس کے بارے میں کیا کہتے ہو خان صاحب.. ادھر کوئی حُرمت، کوئی بے حُرمتی نہیں.. کوئی جنّت، کوئی دوزخ نہیں.. اور کوئی شہادت نہیں جس کی آرزو میں ہم ادھر آئے تھے.. صرف بُو ہے اور موت ہے۔"

"ادھر ہی تہہ خانے میں دفن کر دیتے ہیں.. اتنا دیر دفن کے بغیر رکھنا اجازت نہیں یارا.."

"اس کی قبر تمہارا باپ کھودے گا۔" تھکی ہوئی آواز میں ایک جھنجلاہٹ، ایک غصہ ابلنے لگا۔ "اگر باپ بھی کھودے گا تو کیسے کھودے گا.. ہیں؟"

"یارا باپ تک مت جاؤ.. بیگ تم ٹھیک کہتا ہے۔ مجھے بھی معلوم ہے کہ ہم اٹھنے سے بھی لاچار ہے تو قبر کیا خاک کھودے گا.. پر یارا یہ ہمارا ساتھی تھا تو بس خواہش کرتا ہے کہ اس کا لاش خراب نہ ہو.. یا ایسا کرو کہ اسے اٹھا کر.. سب کوشش کرے تو کیا پتہ اللہ تعالیٰ مدد فرمائے اور ہم اسے اٹھالے.. تو اسے اٹھا کر اوپر ان بھائیوں کے برابر میں رکھ آتے ہیں، اس پر بھی انوار کا بارش ہو گا۔"

"نہیں..." وہاب کا ردّعمل فوری تھا۔ "اس کی لاش ان میں بڑی دور سے پہچانی جائے گی کہ یہ تازہ تازہ مرا ہے.. اس کا مُردہ ابھی سالم ہے... منہ میں مٹی نہیں اور ہاتھ کھلے ہیں اور ابھی ڈھیلا ہے، اکڑا ہوا نہیں تو دور سے پہچانا جائے گا اور پھر وہ جان جائیں گے کہ یہاں ہم ہیں.. نہیں۔"

"یہ بھی عقل کی بات ہے عربی۔" گل شیر نے ہتھیار ڈال دیئے۔

"ٹھیک ہے ادھر ہی پڑا رہنے دو ہمارے پاس... رونق رہے گا.. ساتھی ہے چاہے مُردہ ہے۔"

ان پر کچھ لمحے.. بے حد مختصر اور طویل وقفوں کے بعد ایسے آتے تھے جب وہ باقاعدہ چہکنے لگتے تھے، اگرچہ کراہتے ہوئے لیکن بولنے لگتے تھے.. جدھر جدھر پڑے تھے، ادھر پڑے باتیں کرنے لگتے تھے اور پھر ان کی سکت ساتھ چھوڑ جاتی تھی اور وہ بے ہوشی میں چلے جاتے تھے..

اسی بے ہوشی میں اترتے ہوئے ان کو شائبہ ہوا کہ اوپر قلعہ جنگی کے صحن میں کوئی ہے.. کوئی چلتا ہے.. یہ صرف شائبہ ہی ہو سکتا تھا، وہاں کس نے ہونا تھا.. شمال والے قندوز اور مزار شریف کے بعد کابل کی جانب بڑھنے کی تیاریوں میں مگن تھے.. امریکی طیارے دن رات اس مفروضے کو باطل ثابت کر



رہے تھے کہ کوہسار باقی افغان باقی.. نہ کوہسار تاب لا رہے تھے اور نہ افغان.. کارپٹ بومبنگ سے چپہ چپہ ملیامیٹ ہو رہا تھا.. اور کابل کے راستے میں جتنی بھی آبادیاں تھیں، دیہات تھے، انہیں ڈیزی کٹر۔ کلسٹر اور بنکر بسٹر دفن کر رہے تھے..

تو ادھر کس نے دھیان کرنا تھا..

کس نے آنا تھا..

اگر کوئی ادھر آنے کی نیت بھی کر لیتا تو اتنی بُو اسے واپس دھکیل دیتی۔

مزار شریف سے کوئی بھی انسان کئی دن سے ادھر نہیں آیا تھا..

صرف ایک بچہ فرمان اللہ آیا تھا جس نے واپسی پر اپنے تمام دوستوں کو اطلاع کر دی تھی کہ ابھی قلعہ جنگی کا صحن فٹ بال کھیلنے کے لیے موزوں نہیں..

البتہ کچھ کتے آئے تھے..

وہ بُو سونگھتے آئے تھے..

پچھلی رات آئے تھے..

یہ کتے پچھلی رات بُوتھیاں اٹھا کر قلعہ جنگی کے اوپر جو آسمان تھا اور جو ابھی تک نہیں گرا تھا، اس کی جانب بُوتھیاں اٹھائے دیر تک روتے رہے تھے..

ان کتوں نے چند لاشیں بڑی رغبت سے جھنجوڑی تھیں.. ایک آدھ بوٹی بھی نوچی تھی لیکن انہیں بھی یہ مُردار حسب ذائقہ نہیں لگا تھا.. انہیں بھی بُو آتی تھی اور وہ ساری رات رونے کے بعد مزار شریف واپس چلے گئے تھے اور وہاں مزار کے گرد طواف کرنے والے زائرین جب باہر آتے تھے تو ان کے سامنے دُم ہلا ہلا کر روٹی کے ایک چپے کی خواہش کا اظہار کرتے تھے.. اگرچہ انہیں اس میں کامیابی کم ہی نصیب ہوتی تھی.. وہ تو پھر کتے تھے، انسان کے بچے بھی لاکھوں کی تعداد میں بھوکے تھے اور کسی کے آگے دُم بھی نہیں ہلا سکتے تھے.. مسلسل خانہ جنگی..

مسلسل جہاد... طالبان کی بے پروائی اور خشک سالی سے ملک بھر میں دھول اٹھتی تھی اور پیٹ خالی تھے.. صرف کتے آئے تھے، شائد گدھ نہیں آئے تھے..

صحن میں بکھرے مردوں کو یہ سہولت مل گئی تھی کہ انہیں گدھوں نے نہیں نوچا تھا کیونکہ مزار شریف اور بلخ کے علاقوں میں گدھ بہت کم تعداد میں پائے جاتے تھے.. قحط نہ بھی ہوتا تو ادھر مال مویشی کم ہوتے تھے، اس لیے کم مرتے تھے اور گدھوں کے لیے رزق کا فقدان تھا..

ایک زمانے میں ادھر گدھوں کا راج ہوا کرتا تھا..

وہ دور دور سے.. ادھر ازبکستان اور تاجکستان سے اور بدخشاں سے جوق در جوق ادھر آتے تھے کہ ادھر رزق بہت ہوا کرتا تھا.. جب بلخ آتش کدوں کا شہر تھا.. آتش پرستوں کے بلند موت کے میناروں پر دھرے مُردے ان کی ضیافت کا سامان بنتے تھے.. وہ مُردے قلعہ جنگی کے صحن میں بکھرے مُردوں سے کہیں زیادہ پُرذائقہ ہوا کرتے تھے کیونکہ تازہ تازہ ہوا کرتے تھے.. اور پھر جب ادھر اسلام کے عقیدے نے جڑیں پکڑیں تو گدھوں کا رزق کم ہو گیا.. وہ اپنے مُردوں کو دباتے تھے.. گدھ ان علاقوں سے کوچ کر گئے..

شائد کبھی ایک آدھ گدھ قلعہ جنگی کے صحن میں بھی اترا ہو اور اتنے متعفّن گوشت کو سامنے پا کر اسے بھی ابکائی آگئی ہو کہ بے شک ایک گدھ ہو، پھر بھی اس کی بھی تو حسِ جمال ہوتی ہے اور وہ ایک دو نوالے اپنی چونچ میں بھر کر تائب ہو گیا ہو اور چلا گیا ہو.. شائد ایک آدھ گدھ... بہرحال سرکاری طور پر اس کا کوئی ریکارڈ نہیں محض قیاس ہے..

اُن سب پر ایک طویل وقفے کے بعد وہ لمحہ پھر آیا جب وہ اپنی سکت مجتمع کر کے بول سکتے تھے..

دھوپ چوتھی سیڑھی کے آس پاس تھی اور اوپر دوپہر ہونے کو تھی..



سب سے پہلے جانی نے گھوڑے کے ڈھانچے سے اپنے بازو الگ کیئے..

اور ہاں جب وہ بولتے تھے تو ایک دوسرے کا سامنا کر کے تو نہیں بولتے تھے۔ جدھر جہاں کوئی بھی ہوتا تھا، اپنی نیم مُردنی میں بولتا تھا اور جو جہاں بھی ہوتا تھا وہاں سے جواب دیتا تھا اور اندھیرا حکمران رہتا تھا.. چوتھی سیڑھی پر دھوپ اتر آنے سے بھی تہہ خانے کی تاریکی میں نمایاں فرق نہیں پڑتا تھا..

اور کبھی وہ بیک وقت بولنے لگتے.. کسی کو بھی مخاطب نہ کرتے، اپنے آپ سے.. اندھیرے سے اللہ بخش کی لاش سے... گفتگو کرنے لگتے..

تو جانی نے گھوڑے کے ڈھانچے سے اپنے بازو الگ کیئے اور ذرا سا کھسک کر کسی کے قریب ہوا۔ "کوئی بتائے گا کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے؟"

"کیا پتہ کیا کرنا ہے امریکی.." یہ گل شیر تھا جس کے قریب جانی ہوا تھا..

"مر جانے کا انتظار تو نہیں کرنا.. ہم نے ہتھیار زندہ رہنے کے لیے ان کے حوالے کیئے تھے.. پھر اس تہہ خانے میں آچھپے ہیں تو مر جانے کے لیے تو نہیں آئے، اس آس میں آئے ہیں کہ شائد زندہ رہ جائیں.. تو ہمیں ابھی یہ فیصلہ کرنا ہے کہ اب ہم کیا کریں گے.. میں تم سب کی نسبت زیادہ مُردنی میں ہوں اور ہو سکتا ہے کہ رات تک میں بھی اللہ بخش کے برابر میں پڑا ہوں.. تم سب کی حالت بھی ایسی ہے کہ رات تک نہ سہی، کل سویر تک تم بھی ہم دونوں کے ساتھ شامل ہو جاؤ گے.. تو پھر ابھی سے فیصلہ کر لیں کہ کیا کرنا ہے.."

"تم بتاؤ.. تم خود بتاؤ جانی.."

"میں کیا بتاؤں.. میں جانتا تو تم سے کیوں پوچھتا.. کیونکہ میں تو شک اور شرمندگی کی دلدل میں پھنسا ہوں کہ یہ میں نے کیا کیا.. کن کے لیے لڑنے کے لیے آگیا.. براؤنی نے مجھے یہ احساس دلایا.."

"براؤنی نے.."

"ہاں، میرے ذاتی پونی براؤنی نے.. وہ ابھی ابھی میرے خواب میں تھا۔ میں اس پر سوار ایک ہرے بھرے وسیع میدان کے بیچ میں دلکشی چال پر جارہا ہوں.. اس کی پیٹھ تھپک رہا ہوں جس کی جِلد ڈوبتے سورج کی کرنوں میں چمک رہی ہے اور وہ مجھ سے کہتا ہے.. جانی اپنے آئیڈیل کے حصول کے لیے تمہاری نیّت پر شک نہیں کیا جاسکتا لیکن تم نے ابھی تک ٹھنڈے دل سے سوچا نہیں... جذبات میں بھڑکتے ادھر آنکلے ہو.. کہیں ایسا تو نہیں کہ تم طالبان کا ساتھ دے کر جہالت اور پسماندگی کو فروغ دے رہے ہو.. بے شک وہ نیّت کے کھرے اور شفاف لوگ ہیں لیکن تم جانتے ہو کہ وہ پتھر کے زمانے کا ایک سماج قائم کررہے ہیں.. جس میں تعلیم یافتہ عورتیں کابل میں بھیک مانگ رہی ہیں.. بیوائیں گھر بیٹھی بھوکی مر رہی ہیں کیونکہ محرم کے بغیر وہ باہر نہیں نکل سکتیں.... کھلاڑی نیکریں نہ پہن سکیں کہ ان کی ٹانگوں کو دیکھ کر ملاؤں کا ایمان ڈگمگانے لگتا ہے.. ریڈیو، ٹیلیویژن سب سے بڑے شیطان ہوں... وہ شمال والوں کی خوبصورت عورتیں چن چن کر اٹھا لائیں اور زبردستی ان سے نکاح پڑھوالیں۔ ایک افراتفری اور بربادی ہو.. تمہیں پتہ ہے کہ تمہارا امیر المومنین ملا عمر کبھی قندھار سے نکل کر ہرات تک نہیں گیا.. کیا یہی تمہارا تصور کامل ہے.. یہ کیسا جہاد ہے جس میں تمہارے مقابل بھی تمہارے ہی عقیدے کے لوگ ہیں.. یہ تم کیا کررہے ہو..."

جانی یکدم چپ ہوگیا..

"یہ تم سے تمہارے پونی نے کہا.. براؤنی نے کہا؟"

"ہاں...."

"پہلے کیوں نہیں کہا... اب جاکر جب بہت دیر ہوگئی ہے، کیوں کہاں.."

"اس لیے کہ ابھی... ان مردہ حالتوں میں پہنچ کر اس تہہ خانے کی تنہائی



میں تو مجھے سوچ بچار کا موقع ملا ہے... بھڑکتے ہوئے جذبات کی آگ سرد ہوئی ہے تو میں راکھ کریدنے کے قابل ہوا ہوں.. اور یوں میرے اندر ایک تصور کی جو ناقابل تردید تصویر موجود تھی، اس کی تردید ہونے لگی ہے.. اس میں دراڑیں پڑنے لگی ہیں.."

"تم بھٹک گئے ہو جانی.. راہ راست سے ہٹ گئے ہو۔" ہاشم میر کے اندر بھی ایسے بے شمار شک ایک عرصے سے بسیرا کرتے تھے لیکن وہ جان بوجھ کر ان کی جانب دھیان نہ دیتا تھا اور اب جب کہ جانی انہی کا اظہار کررہا تھا، وہ خوفزدہ ہو گیا تھا اور اپنے آپ کو ڈھارس دینے کی خاطر وہ غرایا۔ "موت سے ڈرتے ہو؟"

"ڈر اس شے سے جاتا ہے جو ناگہانی اور یکدم ہو.. میں تو جانتا ہوں کہ میں یقینی طور پر اس کائنات میں چند لمحوں کا مہمان ہوں اور میں یقینی طور پر زندہ نہیں رہوں گا.. لیکن میرے اندر شکوک ہیں ہاشم میر.. پہلے نہیں تھے، اب ہیں کہ میرا وجود تہذیب کے ارتقاء کو روک کر پتھر کے زمانے تک واپس لے جانے میں معاون تو نہیں ثابت ہو رہا.. محض ان کی بظاہر پارسائی اور نیکی اور نیت کا کھرا پن کہیں مجھے بھٹکا تو نہیں رہا.. یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اسلام کی جو توجیہہ وہ کر رہے ہیں، صرف وہی درست ہو اور بقیہ دنیا کے سارے مسلمان راہ راست پر نہ ہوں.. کیا ایسا تو نہیں کہ انہوں نے اپنی کم علمی اور تعصّب.. جس پر انہیں اختیار نہیں.. کے باعث اس عظیم دین کو تقویت دینے کی بجائے ضعف پہنچایا ہو.. مجھے پہلے شک تھا اور اب یقین ہے کہ انہوں نے یہی کیا ہے.."

"جانی.." بیگ نے اس کے کندھے پر ایک ہلکی سی تھپکی دی لیکن بدقسمتی سے اس تھپکی کے نیچے وہ گولی آگئی جو جانی کے کندھے میں قندوز میں گئی تھی اور ابھی تک وہیں ٹھہری ہوئی تھی.. اور وہ زور زور سے کراہنے لگا..

"سوری جانی.. سوری" بیگ نے دونوں ہاتھ اوپر کردیئے۔ "دیکھو

جانی، اب طالبان کو بھول جاؤ کہ وہ کیا تھے اور کیوں تھے.. وہ ہمیں ایک فاصلے سے بہت کامل لگتے تھے اور ہم پر بھی تصور کا خواب چھایا ہوا تھا اور ہم چلے آئے.. ہم اب اس ساعت میں طالبان کا دفاع نہیں کر رہے.. اپنا دفاع کر رہے ہیں.. طالبان تو پہلے بھی محض ایک بہانہ تھے.. جانی، انسانی تاریخ ذاتی بہانوں سے بھری پڑی ہے... صلیبی جنگیں کیا تھیں.. ہر ایک کا انفرادی بہانہ تھا اور تمہارے والد کا کمیونزم کیا تھا.. بہت سے انفرادی تعصب اور خواب تھے جو یکجا ہوئے.. اور پورے نہ ہوئے..‘‘

’’یارا.. تم لوگ جب اس طرح کا اونچا اونچا بات کرتے ہو تو ہمارا سمجھ میں نہیں آتا..‘‘ گل شیر اتنی طویل باتیں سنتا سنتا جھلا گیا تھا۔ ’’یارا ہم تو یہ جانتا ہے کہ ہم ادھر جان دینے کو.. شہید ہونے کو آیا ہے تو ہو جائے گا، اس میں کیا جھگڑا مگڑا ہے.. جہاد پر آگیا تو کیا تقریر کرتا ہے.. سوال کیا پوچھتا ہے.. ادھر شہید ہو جائے..‘‘

’’ہاں...‘‘ جانی بولا... اس نے گل شیر کی سنی ان سنی کر دی۔ ’’ہم یہاں اپنا دفاع کر رہے ہیں، تم ٹھیک کہتے ہو....‘‘

اوپر قلعہ جنگی کی دوپہر میں کتے نہیں تھے..

یہ انسانی قدموں کی چاپ تھی اور آواز تھی..

ہاں وہاں کچھ لوگ تھے..

بُو سے بھری ہوا کے دوش پر جو تہہ خانے میں اترتی تھی، سوار کبھی فارسی کا کوئی فقرہ ان تک رُک رُک کر آجاتا اور ایک بار امریکی لہجے کی لٹکتی انگریزی ان کے کانوں میں پہنچی..

اوپر لوگ تھے..

وہ یہاں کیا کرنے آگئے تھے...



چی چی بہت مدھم سرگوشی میں جیسے اپنے آپ سے کہنے لگا۔ ’’یہ جان گئے ہیں کہ ہم یہاں ہیں.. انہیں کسی نہ کسی طرح علم ہو گیا ہے کہ ہم یہاں ابھی تک زندہ ہیں.. اپنے ہتھیار سنبھالو.. ہمارے پاس صرف تین کلاشنکوفیں ہیں.. گولیاں بہت ہیں.. کسی کی انگلی میں کچھ سکت ہے کہ لبلبی دبا سکے.. یہ کسی بھی لمحے نیچے آسکتے ہیں..‘‘

وہ سب ایک ہی چندھیا دینے والے لمحے میں یکسر بھول گئے کہ وہ نیم مردہ حالت میں ہیں.. موت کی چوکھٹ پر ہیں.. سرد اور سخت گوبر اور اپنی ہی غلاظت میں لتھڑے ہوئے ہیں اور ان کے سامنے گھوڑے کے گوشت کے وہ لوتھڑے ہیں جنہیں ان کے معدوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور وہ اس قابل نہیں کہ ایک کروٹ بھی بدل سکیں اور اس کے باوجود وہ سب ایک ہی چندھیا دینے والے لمحے میں چوکنے اور ہوشیار ہو گئے... ان کی تمام تر حسیں متحرک ہو گئیں.. ان کی نظریں پہلی سیڑھی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں جس پر اگر انہیں بوٹ دکھائی دیتے تو اتنی سکت جمع ہو گئی تھی کہ وہ اس پر فائر کر سکتے..

بہت دیر گزر گئی، اس چوکنی کیفیت میں لیکن پہلی سیڑھی خالی ہی رہی..

لگتا تھا کہ اوپر جو لوگ ہیں محض تفریح کی خاطر چل پھر رہے ہیں.. سیر کر رہے ہیں.. کچھ دیر بعد ان کی آوازیں دور ہونے لگیں.. قدموں کی چاپ مدھم ہو گئی.. انہیں شائبہ بھی نہ ہوا تھا کہ لاشوں کی اس بستی کے نیچے کوئی زندہ سانس بھی ہو سکتا ہے..

’’یارا میں پتہ کرتا ہوں..‘‘ گل شیر کہنیوں کے زور پر اوپر ہوا، پیپ سے رستے زخموں سے چپکی شلوار کا پائنچہ اڑستا اٹھ بیٹھا اور پھر ایک ایسی ہمت کو بروئے کار لا کر جو اس کے اور اس کے ساتھیوں کے گمان میں بھی نہ تھی، سیڑھیوں پر گھسٹتا اوپر پہنچ گیا.. ان سب کی آنکھیں کھلی تھیں اور گل شیر کو اس حیرت ناک

کارنامے پر داد دیتی تھیں.. وہ نہ صرف اپنے وجود کو اوپر تک لے گیا تھا بلکہ کلاشنکوف کے بھاری لوہے کو بھی گھسیٹتا ساتھ لے گیا تھا..

وہ پہلی سیڑھی سے آگے نہیں گیا.. صرف اس کے پاؤں نظر آرہے تھے.. کٹے پھٹے کپڑوں سے بھری دراڑوں والے پاؤں اور اس کا بقیہ دھڑ قلعہ جنگی کے صحن میں تھا..

کچھ دیر بعد وہ تقریباً لڑھکتا ہوا تہہ خانے میں آگرا۔ "یارا ادھر تو دوستم سیر کرتا ہے۔"

"دوستم؟.." تقریباً سب نے جو بول سکتے تھے، یک زبان... ہو کر کہا۔

"گھنی ابروؤں اور گھنگھریالے بالوں والا رشید دوستم؟" ہاشم میر کی آواز میں ایک خفیف سا خوف تھا..

"ہاں یارا.. جو کبھی روسیوں کے خلاف لڑتا تھا، اب ان کا ساتھ دے رہا ہے.."

"کیا تمہیں یقین ہے؟"

"میں نے اس کو پہچان لیا ہے یارا... وہی تھا.. اس کے ساتھ کچھ لوگ ہے.. سیر کرتا ہے خانہ خراب.. پہلے سوچا اسے شوٹ کرتا ہے، پھر سوچا فائر کا ڈزمز سن کر سب ادھر کو دوڑ آئے گا اور ہم سب خواہ مخواہ مارا جائے گا.."

"اوپر کیا کر رہا ہے.."

"سیر کرتا ہے ناں.. کبھی کسی لاش کے پاس رکتا ہے اور ٹھوکر لگاتا ہے اور کہتا ہے "غیر ملکی" اور آگے بڑھ جاتا ہے۔ ساتھ میں فوجی بھی ہے اور ایک گورا بھی ہے.. فوجی شلوار قمیض میں نہیں، روس کا دیا ہوا پتلون والا وردی اور بڑا بوٹ میں ہے.."

"انہیں یقیناً شک ہے کہ ہم یہاں ہیں.."



"شک ہوتا تو ادھر آجاتا.. سیر نہ کرتا.."

ان کی نظریں پہلے سیڑھی پر چپک گئی تھیں، وہاں سے الگ نہ ہوتی تھیں.. وہیں پتھر ہو گئی تھیں.. چوکنے اور انتظار کرتے ہوئے..

کبھی ان کی آوازیں واضح ہونے لگتیں جو اوپر صحن میں چلتے تھے اور کبھی دور ہو جاتیں.. اور کبھی کوئی بھی چاپ نہ ہوتی..

وہ سب چوکنے ہو گئے تھے سوائے اللہ بخش کے.. مُردوں کے چوکنے ہو جانے کی روایت نہ تھی.. تہہ خانے کی کچی چھت کو سہارتے پرانے سال خوردہ شہتیروں میں سے مٹی گرتی تھی.. وہ اس مٹی کو گرتے ہوئے دیکھ نہیں سکتے تھے، ہاں جب وہ چہرہ اوپر کر کے چھت کو دیکھتے تو مٹی کی ایک نامعلوم سی پھوار محسوس کرتے جیسے دھند میں چہرے پر محسوس ہوتی ہے..

وہ ابھی تک اوپر تھے.. چلتے پھرتے تھے..

جب کبھی وہ عین ان کے اوپر آتے تو ان کے قدموں کی دھمک سے چھت میں سے زیادہ مٹی گرنے لگتی۔

اگرچہ اوپر قلعہ جنگی کے صحن میں چلتے لوگوں کی چاپ.. جو دشمن تھے.. کچھ اچھا شگون تو نہیں تھا لیکن بے شمار برسوں کے بعد.. بے شمار برس لگتے تھے۔ اگرچہ صرف چند روز تھے.. ان کے کان کسی اور انسان کی موجودگی سے آگاہ ہوئے تھے اور انہیں زندگی کے ہونے کی نوید دی تھی.. بے شک اس میں ان کی موت کی قربت کی بھی اطلاع تھی لیکن اس کے باوجود وہ ذرا پُرجوش تھے اور ایک گہرے نیم مردہ انہماک کے ساتھ کان لگا کر اس چاپ کو سنتے تھے..

"میں کچھ بولوں تو یارا آپ برا تو نہیں منائے گا.." گل شیر نے سوال کیا اور جواب کا انتظار کئے بغیر کہنے لگا۔ "مجھ میں ابھی اتنا طاقت ہے کہ دوبارہ اوپر جاؤں.. اور ان خانہ خرابوں کو جا کر بولوں کہ یارا کیا ادھر ادھر سیر کرتا پھرتا ہے.."

ادھر آؤ اور سارا معاملہ ختم کرو.. ہم کو سُولی سے اتار دو.. بول دوں؟" کوئی نہ بولا۔

"تو ان کو بولتا ہوں کہ ہم اپنا تین ہتھیار تمہارے حوالے کرتا ہے.. ہم کو اپنا گھر جانے دو۔"

"وہ ہمیں اپنے گھر نہیں جانے دیں گے.."

"کیا پتہ ان کے دل میں نرمی آجائے.."

"ہتھیار ڈال کر بے غیرت نہیں ہونا خان صاحب.. کیسے خان ہو.."

"یارا پہلے بھی تو ڈالا تھا.. مزار شریف میں اب دوبارہ ڈال دیئے تو کیا حرج ہے؟"

"پہلے ڈالا تھا تو کیا ہوا تھا.. اب بھی وہی ہوگا.. بھیڑ بکری کی طرح نہیں مرنا خان صاحب.. ادھر یہ تہہ خانہ مناسب قبر ہے.. اوپر مٹی تو ہے... صحن میں جو پڑے ہیں، ان پر تو مٹی بھی نہیں ہے.."

"یہ کون بات کرتا ہے.. چی چی... وہاب... کون ہاشم... یارا جو بھی بات کرتا ہے، ذرا غور سے سنے.. ہم تو مسخری کرتا تھا... کون کافر کا بچہ ہتھیار ڈالے گا.. یارا گنتی کرو کہ ہتھیار کتنا ہے.. نہیں گنتی کا ضرورت نہیں تین ہے.. ایک میرے پاس ہے، باقی دو کدھر ہے؟"

"ایک میرے پاس ہے گل شیر۔" بیگ نے اطلاع کی۔

"اور ایک میرا خیال ہے کہ میرے پاس ہے.." جانی مشکل سے بولا..

جب سے بیگ نے اسے تسلی دینے کی خاطر اس کا کندھا تھپکا تھا تو اس میں ٹھہری ہوئی قندوز کی گولی اپنے مقام سے ذرا ہل گئی تھی اور بہت اذیت دیتی تھی۔ "ہاں میرے پاس ہے تو پر اس گھوڑے کے ڈھانچے کے نیچے دبی ہوئی ہے.. یہ زندہ ہوتا تو اسے درخواست کرتا کہ پونی ڈیئر ذرا کھسک جاؤ.. لیکن میں اسے کھینچ کر نکال لوں گا.."



"یہ تین کی گنتی مکمل ہو گیا؟.. میں... بیگ اور جانی.."

جیسے ایک اپاہج گھسٹنے کا عادی ہو جاتا ہے..

کینسر کا ایک مریض بے پناہ... بدن کے ہر مُو میں کچوکے دیتی اذیت کو برداشت کرتا چلا جاتا ہے کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں.. اور وہ بے حد نارمل انداز میں جیسے وہ عام زندگی میں ہے.. صحت مند اور توانا ہے.. روزمرہ کی باتیں کرتا چلا جاتا ہے..

جیسے ایک نابینا مجبوراً اندھیرے سے سمجھوتہ کر لیتا ہے، بالکل ایسے وہ اپنے اپنے پیپ بھرے سیپٹک ہوتے زخموں اور بدن میں آہنی کرچیوں اور ٹھہر چکی گولیوں سے سمجھوتہ کر چکے تھے..

ویسے سمجھوتے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اس سے اذیت کم ہو جاتی ہے۔

لیکن روزمرہ کی باتوں میں خلل نہیں آتا..

ان کے جتنے بھی دن اس تاریک زیرزمین قبر نما تہہ خانے میں گزرے تھے تو یہ ایک پکنک تو نہ تھے لیکن اس دوران وہ ایک دوسرے سے آگاہ ہوئے تھے.. اتنے قریب آگئے تھے جیسے ایک ہی ماں کی کوکھ سے جنم لیا ہو.. اکٹھے یہیں اسی تہہ خانے میں پلے بڑھے ہوں.. بچپن کے بعد جوانی بھی یہیں گزاری اور اب... موت کی منتظری بھی یہیں تھی.. کہ اب.. بلکہ آج.. اوپر جو قدموں کی آواز تھی، وہ گویا جدائی کا بلاوا تھا جو دستک دیتا تھا..

یہ جدائی آخری اور مکمل ہونی تھی..

وہ اسی سمجھوتے کی کیفیت میں لاچار اسی آخری جدائی کے خیالوں میں تھے جب پانی آگیا..

پہلی تو تیسری سیڑھی پر دھوپ ٹھہری ہوئی تھی۔ اس میں ایک چمک سی پیدا ہوئی اور پھر ایک مدھم بہاؤ سیڑھیوں سے اترنے لگا.. ایک ناآشنا سرسراہٹ نیچے

اندھیرے میں آئی اور ان کے آس پاس پھیلنے لگی..

"پانی..." بیگ جہاں تھا وہاں اس نے اپنے بدن کے آس پاس ایک سرد سیال کو بہتے اور گیلاہٹ کو چھوتے محسوس کیا..

سیڑھیوں پر سے ایک آبشار اتر رہی تھی اور تہہ خانے کو بھر رہی تھی..

پانی کے ریلے اڈے چلے آتے تھے اور اُن کے اندھیرے میں گرتے تھے..

عبدالوہاب کی ناک جو غلاظت میں دفن تھی، اس میں پانی داخل ہونے لگا اور اس نے اپنے کو بمشکل اٹھایا "پانی" وہ چلایا۔ "واللہ میں بہت پیاسا تھا.. یہ کہاں سے آگیا.. ہماری کربلا میں پانی.." اس نے بمشکل چند گھونٹ بھرے جو اس کے زخم خوردہ اور کٹے پھٹے اندرون میں تیزاب کی مانند اسے چیرتے گئے..

ہاشم میرا اپنی نیم مدہوشی میں تقریباً ڈوب چلا تھا۔ جب اس کے کھلے منہ کے اندر پانی گیا اور سیدھا پھیپھڑوں تک گیا اور وہ بری طرح کھانسنے لگا..

"یار ادھر بارش ہو رہا ہے.." گل شیر کے پاؤں کی دراڑوں میں جب پانی گیا تو وہ آگ کی مانند جلاتا تھا.. "اتنا پانی کدھر سے آتا ہے.."

"میرا پونی ڈوب جائے گا۔" صرف جانی کی آواز میں ایک ڈر تھا اور اس نے گھوڑے کے ڈھانچے کے گرد اپنے بازوؤں کو پھر سے لپیٹ لیا..

پانی جو اُن کے آس پاس بہتے تھے، اب پورے تہہ خانے میں پھیلنے کے بعد آہستہ آہستہ اپنی سطح بلند کر رہے تھے..

یہ پانی بہت سرد تھے..

یخ حالت میں برف بن جانے کی نزدیکی میں.. اتنے سرد تھے..

وہ سبھی اس سرد گیلی لپیٹ میں آکر بے اختیار اور بری طرح ٹھٹھرنے لگے..



"باہر بارش نہیں ہو رہی.." چی چی کے دانت اس کے بس میں نہ رہے تھے جیسے برفباری ہو رہی ہو اور وہ بالکل برہنہ ہو، اسے اتنی سردی محسوس ہو رہی تھی۔ "وہ جان گئے ہیں کہ ہم یہاں ہیں.. انہیں شک ہو گیا ہے کہ اس تہہ خانے میں کوئی ہو سکتا ہے اور انہوں نے یہ چیک کرنے کے لیے کہ کوئی یہاں ہے یا نہیں پانی چھوڑ دیا ہے.. لیکن یہ نرا پانی نہیں، اس میں موت ایسی سردی گھلی ہوئی ہے.. میرے گاؤں کی کسی ندی کا پانی موسم سرما میں بھی اتنا یخ نہیں ہوتا.."

وہ دیکھ نہیں سکتے تھے، صرف محسوس کر سکتے تھے کہ پانی لحظہ بہ لحظہ اونچا ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ پاؤں کو ڈھانپ کر وہ ٹخنوں سے اوپر ہو رہا ہے.. اور وہ ایک نیم مردہ وہیل کی مانند اس میں ہولے ہولے اپنے آپ کو بچانے کی خاطر پھڑکتے تھے..

"ادھر اتنا پانی تو نہیں ہوتا یارا.." گل شیر بھی بری طرح کانپ رہا تھا۔ "ٹینکر تو نہیں لے کر آگیا.."

"ٹینکر..." ہاشم کی آواز آئی۔ "بس وہی تھا.. پچھلی رات کچھ دیر کے لیے میرے کانوں میں کسی انجن کی گھرر گھرر کا ہلکا شور آیا تھا.. میں نے سوچا ہوا ہے اور بہت تیز ہے اور میرے کانوں کو دھوکے میں ڈالتی ہے.. بس وہی تھا.."

"انہوں نے آج نہیں جانا، پہلے سے جانتے ہیں.."

"جانتے ہیں کہ ہم یہاں چھپے بیٹھے ہیں، اس لیے انہوں نے ہمیں باہر نکالنے کے لیے یا ڈبونے کے لیے اتنا ڈھیر پانی چھوڑا ہے.."

"نہیں.." بیگ بولا۔ "انہیں صرف شک ہے.. وہ تہہ خانے میں اترنے سے پیشتر تسلی کر لینا چاہتے ہیں کہ یہاں کوئی نہیں.. اگر انہیں ہماری موجودگی کا یقین ہوتا تو وہ اندر گرنیڈ یا راکٹ پھینکتے.."

اگر وہ اسی حالت میں پڑے رہتے جس میں وہ تھے تو تھوڑی دیر بعد ہوا کی

بجائے پانی ان کے نتھنوں میں جانے لگتا.. انہیں بہر طور اٹھنا تھا.. وہ جیسے بھی اٹھے بار بار گرتے پھر سنبھلتے.. کبھی کھانستے غوطے کھاتے اٹھے اور اٹھ کر بیٹھ گئے.. پانی ٹخنوں سے بھی بہت اوپر ہو رہا تھا اور اس کی برف سردی ایک سرد آری کی مانند ان کے اتنے حصے کو کاٹ رہی تھی..

"خانہ خراب تو ہمیں برف کر کے مار دے گا.. کیا کرے گا.."

اب نہ کوئی بھوک تھی اور نہ پیاس اور نہ ہی کسی زخم کی ٹیسیں اور نہ کسی کلسٹر بم کا کوئی آہنی ٹکڑا یا گولی جوان کے بدن میں بسی ہوئی تھی، بس اس ناگہانی سرد اور گیلی آفت سے بچاؤ کی کوشش تھی..

پانی گھٹنوں سے بھی اوپر ہونے لگا اور انہیں کھڑے ہو جانے پر مجبور کر دیا.. بہت سہجے سہجے پانی بلند ہوتا رہا.. وہ ایک عرصے سے گھسٹتے رہے تھے.. تہہ خانے کی غلاظت میں رینگتے رہے تھے.. بہت ہوا تو دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لی لیکن یوں سیدھے اپنے پاؤں پر کم ہی یوں کھڑے ہوئے تھے.. جیسے اب تھے.. اس کے سوا اور کوئی سبیل نہ تھی.. پانی جب کمر تک آیا تو شام ہو رہی تھی..

شام ہوئی تو سیڑھیوں پر سے اترتی آبشار کے ریلے یکدم تھم گئے..

اتنا پانی انہیں ڈبو دینے کے لیے کافی تھا..

سب کے سب ٹھٹھرتے ہوئے نیم منجمد حالت میں اپنے پاؤں پر کھڑے رہنے.. پانی میں ایستادہ قائم رہنے کی سعی کر رہے تھے اور وہ لرز رہے تھے.. یہ جانتے تھے کہ اگر وہ گر گئے تو دوبارہ کھڑے نہیں ہو سکیں گے اور ڈوب جائیں گے..

گل شیر کے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کلاشنکوف تھامے ہوئے اکڑ چکے تھے.. "یار ابھی سوچا بھی نہ تھا کہ برف ہو کر مرے گا یا پانی میں ڈوب کر شہید ہو گا.."



"میرا پونی نظر نہیں آ رہا.. میری رانیں اس کی پشت کو چھوتی ہیں اور وہ پانی کے اندر ہے.. ڈوب گیا ہے.."

"ڈوب تو اپنا اللہ بخش بھی گیا ہے جانی اور تم ایک مرے ہوئے گھوڑے کا فکر کرتا ہے.. یہ انگریز لوگ بے شک مومن ہو، جہاد کرے پر اس کی عقل مختلف رہتا ہے.. ادھر ایک مسلمان بھائی مرا پڑا ہے تو اس کا کچھ غم نہیں کہ اس کا لاش پانی میں خراب ہوتا ہے، گھوڑا کا فکر کرتا ہے.." گل شیر کے لہجے میں سرد تلخی تھی..

"چلو اچھا ہے کہ گھوڑے کا گوشت نرم ہو رہا ہے خاں صاحب.." بیگ نے اس کی تلخی کو محسوس کرتے ہوئے کہا اور اپنے آپ میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہم یہاں اس پانی میں زیادہ دیر کھڑے نہیں رہ سکتے۔" وہاب بولا۔

"اگر ہم ذرا ہمت کر کے آہستہ آہستہ چلتے سیڑھیوں پر جا بیٹھیں تو.."

"سیڑھیاں کتنی باقی رہ گئی ہیں.. اور اوپر پانی سے بلند ان سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے ہم ان کو صاف نظر آ جائیں گے اور بطخوں کی طرح مارے جائیں گے۔"

"یار بطخیں اتنے سرد پانی میں کیسے رہ لیتی ہیں.."

"کسی بطخ سے پوچھ کر بتاؤں گا.." یہ فقرہ اس قسم کی صورت حال میں صرف بیگ ہی کہہ سکتا تھا.. اور اسی نے کہا..

"ویسے سنا ہے کہ چار بطخوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں.. کیا یہ سچ ہے؟"

"کیا واہی تباہی بک رہے ہو ہاشم.." بیگ اس کی ذہنی حالت کی ابتری پر فکر مند ہو گیا۔ "نہ یہاں بطخیں ہیں اور نہ کوئی خوشی.. اور نہ کوئی سچ.."

اگر اس تاریکی میں کوئی چراغ جلاتا تو اس کی جھلمل میں اسے کمر تک پانی میں ڈوبے چند ہیولے نظر آتے جن میں سے تین اپنے ہاتھ بلند کئے ہوتے، اپنے

ہتھیار بچانے کی خاطر اور بقیہ تین اپنی بغلوں میں ہاتھ دیئے ٹھٹھرتے اکڑتے دکھائی دیتے اور یہ چھ نیلے چہروں اور نیلے بدن والے ہوتے کہ پانیوں کی برفیلی خصلت نے ان کی رنگتیں نچوڑ کر ان میں نیل بھر دیا تھا... ان کا تن من نیلو نیل کر دیا تھا..

شام کے سرمئی نقش پا پر اپنے سیاہ پاؤں دھرتی رات آچکی تھی...

پانی کے قیدی اپنے آپ کو سنبھالتے پر سنبھلا نہ جاتا تھا..

تب ایک دھڑام کی.. ایک شڑاپ کی آواز آئی جیسے دریا کا ریتلا کنارا گئی شب یکدم پانی میں گرتا ہے تو ایک عجیب اداس اور المناک آواز آتی ہے.. اور پھر چی چی کھانسنے لگا..

وہ گر گیا تھا.. اور ایک ڈوبتے شخص کی مانند بے تحاشا ہاتھ پاؤں مارتا، پھر سے کھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا.. اس کے خوف نے اس کی مدد کی تھی ورنہ وہ اس قابل نہ تھا.. اور جان گیا تھا کہ اپنے کانپتے ٹھٹھرتے نیلے بدن کے زخموں کی نقاہت اور بھوک کے ساتھ اگر ایک مرتبہ پھر گرا تو دوبارہ اٹھ نہیں سکے گا..

وہاں منجمد ہوتے اور اس کے باوجود ٹھٹھرتے کانپتے ہاشم میر کی کمر کے گرد... پانی کے اندر سے ایک ہاتھ آیا اور وہ شدید ڈر میں آکر زیادہ کانپنے لگا کہ یہ کون ہے اور کیا ہے.. اس ہاتھ کی انگلیاں اس کی کمر کے گرد لپٹ رہی تھیں..

اس نے اپنا ایک ہاتھ بغل میں سے نکالا اور پانی میں ڈبو کر اپنی کمر کو ٹٹولا تو ایک ہاتھ جیسے اس سے مصافحہ کرنے کی غرض سے اس کے ہاتھ میں آگیا... اس ہاتھ کی انگلیاں نرم اور بے جان تھیں کہ اللہ بخش کی لاش پھول کر ابھر آئی تھی...

تیرتی ہوئی ہاشم تک آگئی تھی...

اور اس سے ہاتھ ملانا چاہتی تھی..

ہاشم ٹھٹک کر اور ڈر میں گرفتہ اس سے پرے ہوا.. اسے ذرا دھکیلا تو وہ



ڈوبتی ابھرتی بیگ کے جُثّے سے جا ٹکرائی..

"یہ تم ہو ہاشم؟"

"نہیں.. یہ اللہ بخش ہے۔"

"وہ تو مر نہیں گیا تھا یارا.." گل شیر چونکا..

"اس کی لاش پانیوں میں تیرنے لگی ہے.. ذرا انتظار کرو خان صاحب.. ابھی تم تک بھی آجائے گی.."

"کیا بے حرمتی ہے یارا.. ہمارا مسلمان بھائی کا لاش بے گور و کفن ادھر پانی میں تیرتا پھرتا ہے.. بے شک یہ تہہ خانہ کا خانہ برباد ہو جائے، پر صبح اس بھائی کو اٹھا کر اوپر قلعہ جنگی کے صحن میں ڈال آئے گا۔"

"صبح تک ہم مر چکے ہوں گے.."

"آگیا ہے یارا آگیا ہے.." گل شیر کو جیسے بچھڑا یار مل گیا ہو۔ "ادھر آگیا ہے ہمارا بھائی.. میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ہے اور اسے ادھر ادھر خجل خوار نہیں ہونے دوں گا.. میرا انگلی میں اپنا انگلی ایسے پھنساتا ہے جیسے زندہ ہو.."

"وہ زندہ نہیں، ہم مردہ ہو چکے ہیں.."

کچھ دیر خاموشی رہی.. پانی کی ٹھنڈک میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا.. اور اس تناسب سے ان کے بدن مزید سرد ہوتے رہے..

"یارا اللہ بخش کو میں چھوڑتا ہوں۔ ایک ہاتھ میں ہتھیار اوپر کیا ہوا ہے اور دوسرے ہاتھ سے اس کو پکڑا ہے تو مشکل ہو رہا ہے.. وہاب بھائی آپ بیکار کھڑا ہے، بغلوں میں ہاتھ دے کر تو تم اسے سنبھال لو یارا.."

"بھیج دو ادھر.."

گل شیر نے اللہ بخش کی لاش کو نہایت پیار سے.. جیسے بچّے کو تھپکی دیتے ہیں.. اس سمت دھکیلا جدھر سے وہاب بولا تھا..

وہ.. اللہ بخش پانی میں تیرتے ایک ٹھنڈے شہتیر کی مانند اس کی کمر سے جا لگا..

وہاب نے پانی میں ٹٹول کر اس کا ایک ہاتھ دریافت کیا اور تھام لیا..

اوپر مکمل سکوت تھا..

کوئی بھی نہ تھا..

پانی چھوڑنے والے بھی نہیں تھے..

وہ مزار شریف کو واپس جا چکے تھے، اپنے اپنے گھروں کی چوکھٹ کے اندر جہاں آتش دانوں میں آگ جلتی تھی..

اگر ان میں سے کوئی ابھی تک اوپر تھا.. اور تہہ خانے کے باہر نشست لگائے تاک میں بیٹھا تھا تو وہ بھی شائد سو چکا تھا۔ اس اطمینان کے ساتھ کہ اول تو اتنے روز تک بغیر خوراک کے کسی ذی روح کا زندہ بچنا ممکن نہ تھا اور اگر کوئی ایسا بچا کھچا ڈھیٹ رہ بھی گیا تھا تو وہ کب کا پانیوں کے اس ریلے میں ڈوب چکا ہو گا.. اگر زندہ ہوتا تو دوہائی دیتا باہر نہ آ جاتا..

وقت گزر رہا تھا..

وہ مر چکے تھے یا زندہ تھے، کون جانتا تھا، سوائے اس کے جو ان کی شہ رگ سے بھی قریب تھا.. وہ جانتا تھا کہ ان کی نبضیں چل رہی ہیں.. کہ وہی انہیں چلا رہا تھا..

تاریکیوں کے سمندر میں چھ جزیرے ابھرے ہوئے تھے اور ساکت تھے..

گھوڑے کا ڈھانچہ کبھی جزیرہ بنتا تھا یعنی سطحٔ آب پر نمودار ہوتا تھا اور کبھی ڈوب جاتا تھا اور اللہ بخش تھا جسے وہاب نے تھام رکھا تھا اور وہ بھی ڈوبتا ابھرتا رہتا تھا.. چھ جوگی تھے جو اس تاریک گپھا میں دُھونی رمائے کھڑے تھے.. ان کا ٹھٹھرنا اور کانپنا بھی موقوف ہو چکا تھا اور وہ سردی میں نیلو نیل ہوئے ساکت



اور منجمد سے ہو چکے تھے..

رات ہو چکی تھی..

چاندنی.. مگر چاندنی کی بناوٹ اور اس کا دھوکا سیڑھیوں پر براجمان ان کو دیکھتا تھا.. شائد آخری بار دیکھتا تھا..

رات کا کوئی پہر تھا..

کونسا پہر تھا، اس کا ریکارڈ صرف ملک الموت کے رجسٹر اندراج میں تھا... نہ صرف پہر بلکہ وہ ساعت، وہ گھڑی بھی درج تھی اور اس ساعت عبدالوہاب کی کُل ہمّت... ساری سکت اس کی یخ بستہ ہڈیوں اور زخموں اور بھوک کو یکدم خالی کر گئی.. ہر انسان چاہے وہ ایک تصور کامل پر کتنا ہی یقین کیوں نہ رکھتا ہو، کیمبرج کا تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو.. ابونواس اور امراؤالقیس کی شاعری کا کتنا ہی دلدادہ کیوں نہ ہو... بالآخر ڈھے جاتا ہے..

وہ.. عبدالوہاب ابھی کھڑا تھا.. اور ابھی پانی میں گر گیا..

اس نے کوئی تگ و دو نہ کی.. شائد وہ اس یخ بستہ بھوکی ایستادگی میں ہی مر چکا تھا اور اب جا کر اس ساعت میں جو ملک الموت کے رجسٹر میں درج تھی... وہ پانی میں گرا تھا..

اس نے کوئی تگ و دو نہ کی.. ہاتھ پاؤں نہ مارے، ایک منجمد پتھر کی مانند پانی میں ڈھے گیا.. اور پھر نہیں ابھرا.. اور اتنی آہستگی سے گرا کہ پانیوں کو بھی خبر نہ ہوئی کہ کوئی ان میں گرا ہے..

پانیوں کو تو کیا اس کے ساتھیوں کو بھی خبر نہ ہوئی کہ وہ اب ان میں نہیں ہے..

وہی رات تھی.. مسلسل تھی.

اسی رات کا ایک اور پہر تھا..

سویر کی نزدیکی میں کوئی پہر تھا..

اور یہ پہر.. اور یہ ساعت بھی کہیں درج تھی..

فیصلہ ہو چکا تھا کہ پہر کونسا ہوگا... کونسی ساعت ہوگی.. جب ابو طالب کا جما ہوا وجود بہت آہستگی سے... ایک ڈوبتی کشتی کی مانند دھیرے دھیرے پانی میں غائب ہو گیا.. یہ وجود کبھی کیسے قیاس کر سکتا تھا کہ اس کی قبر پر عقاب پرواز نہیں کریں گے اور وہ کسی جھرنے، کسی چٹان کی گود میں دفن نہیں ہوگا.. اسے پانی کی موت آئے گی..

اس جزیرے کے ڈوبنے کا احساس بھی کسی اور ساتھی جزیرے کو نہ ہوا کہ وہ بھی خاموشی سے پانی میں اتر گیا تھا..

جو کھڑے تھے، وہ بول نہ سکتے تھے۔ بولنے کی سعی کرتے تو ان کے دانت کٹکٹانے لگتے اور ان کے ہونٹ کٹتے تھے۔ انہیں علم ہی نہ ہوا کہ اب وہ صرف چار ہیں۔

سویر ہوئی..

ایک اور سویر ہوئی..

اور جب وہ سویر ہوئی.. دھوپ پہلی سیڑھی پر آئی تو وہ سیڑھی ابھی تک گیلی تھی تو اس نے.. دھوپ نے.. نیچے تہہ خانے کی تاریکی میں جھانکا تو وہاں پانی پر تین ایسی کشتیاں تھی جو پھول کر ابھر چکی تھیں اور ڈبکتی ابھرتی تیرتی تھیں..

گل شیر کے برفیلے پتھر پپوٹے کھلے تو تیسری سیڑھی پر اتر چکی دھوپ کی ہلکی روشنائی میں اس نے ان تینوں کو اپنے آس پاس تباہ شدہ جہاز کے تختوں کی مانند پانی پر تیرتے دیکھا.. اس کی انگلیاں لبلبی پر جم چکی تھیں.. اس کے لوہے کے ساتھ چمٹ چکی تھیں... اس نے کوشش کی کہ وہ انہیں وہاں سے الگ کر کے ان تینوں کو نہ سہی، چی چی اور وہاب کو ذرا ٹٹول کر دیکھے تو سہی کہ ان میں کہیں زندگی



کی کوئی رمق موجود ہے کہ نہیں.. کہیں وہ شغل کے طور پر تو یونہی ڈوبتے ابھرتے موج میلہ نہیں کر رہے اور وہ انہیں مردہ سمجھ بیٹھا ہو.. اس نے کوشش کی.. لبلبی پر چمٹی ہوئی انگلی کو الگ کرنے کے لیے اسے جھٹکا دیا تو وہ.. لبلبی.. دب گئی..

تہہ خانے کے اندرون میں اتنے زور کا دھماکا ہوا کہ وہ تین لاشیں بھی ایک لمحے کے لیے ٹھٹک سی گئیں.. گھوڑے کی تھوتھنی پانی سے یکدم ابھر آئی.. اور اگر اس میں جان ہوتی تو وہ یقیناً اس یکدم دھماکے سے خوفزدہ ہو کر ہنہناتی..

دھماکے کی گونج تادیر پانی کی سطح اور تہہ خانے کی چھت کے بوسیدہ شہتیروں کے درمیان بھٹکتی رہی.. بھٹکتی ہوئی تہہ خانے میں سے سیڑھیاں طے کرتی اوپر گئی اور قلعہ جنگی کے کچے صحن میں پہلی دھوپ میں اکڑتے مسخ شدہ بُو دیتے، گلتے سڑتے پیکروں پر سے گزرتی ہو سکتا ہے کہ مزار شریف تک چلی گئی ہو۔ یہ اعلان کرتی کہ "کوئی ہے.. کوئی ہے.."

کون ہے؟

اُس تہہ خانے میں کوئی ہے..

جہاں کسی کا ہونا ممکن نہ تھا، وہاں کوئی ہے..

اس ناگہانی اور یکلخت دھماکے نے جہاں کئی روز کی مکمل خاموشی کی دھجیاں بکھیر دیں وہاں ہاشم میر.. مرتضیٰ بیگ، گل شیر اور جانی واکر کے منجمد شدہ تقریباً مر چکے اجسام پر بھی اثر کیا اور وہ پانی میں کھڑے کھڑے یکدم اپنے زندہ ہونے کے احساس سے جا ٹکرائے..

"اوئے نامراد پٹھان.." بیگ اس منجمد ناتوانی میں جتنا بھی چیخ سکتا تھا، ایک بیٹھی ہوئی سرگوشی میں چیخا "یہ تم نے کیا کیا خاناں.. فائر کر دیا.."

"نہیں.." گل شیر کی آواز مردہ تھی۔ "یارا جان بوجھ کر نہیں کیا.. انگلی

لبلبی پر چمٹ گیا تھا.. الگ کرنے کی کوشش میں دب گیا.. تو یارا یہ فائر میں نے نہیں.. تقدیر نے کیا ہے.. فنا نے میرا انگلی زبردستی دبایا ہے۔ میں نے نہیں دبایا.. تم قسم لے لو..''

''اب وہ جان جائیں گے کہ یہاں ہم ہیں.. اور زندہ ہیں۔''

''تو اچھا ہے یارا.. جان جائیں.. یہ تماشا تو ختم ہو.. یہ مداری کا تماشہ ختم ہو جائے تو اچھا نہیں ہے.. خواہ مخواہ ادھر پانی کی قید میں برف کا جزیرہ بنتا ہے تو بہتر نہیں ہے کہ تماشہ ختم ہو اور وہ جان جائیں کہ ہم یہاں ہے...''

ان میں جتنا بھی دم تھا اسے سادھے ہوئے وہ چپ کھڑے رہے اور پھر کچھ ساعتوں کے گزرنے پر جانی کی پُر مسرت آواز آئی۔ ''مجھے لگتا ہے میرا پونی بھی پھول کر اب پانی پر تیرنے لگے گا... میں اس کو تھپک سکوں گا۔''

''شٹ اپ جانی..'' مرتضیٰ بیگ بیٹھی ہوئی آواز میں بولا..

پانی پر ابھی تک تین لاشیں، چند ڈرم اور کارٹن تیر رہے تھے۔ ان کے درمیان گھوڑے کا سر ابھرنے لگا..

گل شیر کے فائر کے دھماکے کی آواز اگرچہ تہہ خانے میں سے نکل کر مزار شریف تک مار کر چکی تھی اور شاید بلخ کے کھنڈروں میں براجمان پارسی بوڑھے کی آگ کو ذرا تھرتھرایا بھی تھا لیکن اس کا کچھ حصہ ابھی تک تہہ خانے کے اندر گونج رہا تھا..

''یہ.. یہ بھی ممکن ہے.. کہ کسی نے اس فائر کو نہ سنا ہو.. باہر ان دنوں اتنے فائر ہوتے رہتے ہیں اور ان میں ایک اور فائر شاید کسی نے نہ سنا ہو۔''

''نہیں ہاشم میر.. یہ ایک فائر کبھی اَن سنا نہیں جا سکتا کیونکہ وہ اسی ایک فائر کے منتظر ہیں اور اس کی آواز میں ان کی مکمل فتح پنہاں ہے تو وہ اسے سن چکے ہیں۔''



''ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا.. اوپر کوئی بھی نہیں، قدموں کی چاپ بھی نہیں۔''

''پہلے تو انہیں شک تھا، اب یقین ہو گیا ہو گا۔ اس لیے وہ باتیں کرتے، سیر کرتے نہیں خاموشی سے دبے پاؤں آئیں گے.. چاپ نہیں سنائی دے گی۔''

انہوں نے اللہ بخش کا ماتم تو بہت کیا تھا کیونکہ وہ پہلی موت تھی لیکن وہاب اور ابو طالب کے رخصت ہونے پر وہ آبدیدہ بھی نہ ہوئے کہ ان کے آنسو برف ہو چکے تھے.. وہ خود مردہ ہو چکے تھے اور صرف فائر کی آواز نے انہیں ایک بار پھر زندگی میں دھکیل دیا تھا.. وہ دونوں ان کے آس پاس تھے، ڈوبتے ابھرتے۔ کبھی ان کے پانی میں غرق بدنوں کے کسی حصے سے چھوتے.. لیکن اس کے باوجود انہوں نے ان دونوں کا سوگ نہ منایا کہ وہ اس حقیقت کو قبول کر چکے تھے کہ بس یہی ہونا تھا بلکہ ان کے لیے بہتر ہوا کہ وہ یوں چپکے سے پانی میں ڈھے کر آزاد ہو گئے..

ان چاروں کے بچے کھچے زخم خوردہ نیلے پڑ چکے، بدن اب انسانی ضرورتوں اور حسیات سے ماورا ہو چکے تھے.. کیونکہ وہ انسان نہیں رہے تھے.. نہ کہیں بھوک تھی اور نہ پیاس، نہ ہی کوئی اذیت یا سردی کا احساس.. وہ کمر تک آئے سرد پانی میں بُت بنے بغیر کسی کوشش یا تردّد کے.. پتھر ہو چکے تھے..

دوپہر ہو گئی..

اوپر ابھی تک خاموشی تھی..

کوئی نہ تھا..

البتہ گلتی سڑتی لاشوں پر سے جو ہوا سرسراتی گزرتی تھی اس کی ہلکی سی آواز سیڑھیوں سے اتر کر پانیوں پر تیر جاتی تھی اور اس کے سوا اوپر کوئی نہ تھا..

دوپہر ہو گئی..

پھر ڈھلنے لگی..

پانی میں ایستادہ بُت نہ کسی دوپہر میں تھے اور نہ کسی رات میں.. وہ سناٹے کے کسی موسم میں گم بے جان تھے..

دھوپ اٹھنے لگی..

تیسری سیڑھی سے اٹھ کر دھوپ پہلی سیڑھی پر جا ٹھہری.. کسی ایک گھڑی، کسی ایک ساعت... جب وہ چاروں ایک دوسرے کے وجود سے بھی ناآشنا تھے، سناٹے کے کسی موسم میں گم تھے۔ اتنے کہ اگر اس لمحے ان کے سامنے ان کا کوئی عزیز.. ایک ماں.. یا باپ بھی آ کھڑا ہوتا تو انہیں احساس تک نہ ہوتا اور نہ وہ اسے دیکھتے تب کسی ایک گھڑی.. کسی ایک ساعت میں.. پہلی سیڑھی پر دو بوٹ آئے اور ایک سایہ پڑا اور پھر اس کے ہاتھوں میں سے ایک آتشیں وجود نکلا اور تہہ خانے کے اندر پل بھر کے لیے اتنی چکاچوند روشنی ہوئی جیسے کوئی بارات آ گئی ہو اور پھر ہر شے کو پھاڑ دینے والا ایک دھماکہ اس روشنی کے بجھتے ہی بلند ہوا.. اس آتشیں وجود نے پانیوں کو ادھیڑ ڈالا.. ان کے اندر گھوڑے کے ڈھانچے کے پرخچے اڑا دیئے اور اس کی تھوتھنی اس سے الگ ہو کر کچھ دیر کے لیے فضا میں معلق ہوئی اور پھر پانی میں گر گئی..

جانی نے جیسے کچھ بھی نہ سنا ہو.. اس کے سامنے سینکڑوں شرارے سے چھوٹے لیکن اس نے انہیں بھی نہ دیکھا ہو.. اس نے صرف گھوڑے کی تھوتھنی کو بقیہ ڈھانچے سے الگ ہو کر اپنے قریب گرتے دیکھا اور اسے تھپک کر بولا "پونی..."

پہلے کے فوراً بعد دوسرا آتشیں وجود فائر ہوا..

یہ راکٹ وقفے پر یقین نہ رکھتے تھے.. جیسے پانی ایک آبشار کی صورت اترے تھے بنا کسی وقفے کے۔ ایسے یہ آتشیں وجود تہہ خانے کے مختصر وجود میں



مسلسل ایک تواتر سے اترتے تھے اور اپنی مرگ ناک سلگتی آہنی کرچیاں بکھیرتے ہرسُو چکاچوند کرتے جاتے تھے.. ہر شے کو ادھیڑتے جاتے تھے.. در و بام کو تہہ و بالا کرتے، پانیوں میں ہلچل مچاتے یہ راکٹ پہلی سیڑھی پر کھڑا کوئی شخص یا کئی شخص فائر کر رہے تھے.. پانچویں راکٹ نے تہہ خانے کے دو شہتیروں میں جا چھید کیا اور چھت پھاڑ کر اوپر نکل گئے.. اور جہاں شگاف ہوا، وہاں سے جانی کو پہلی بار آسمان کا ایک ٹکڑا نظر آیا جو نیلا اور زندگی سے دھڑکتا تھا اور جس لمحے اس نے نظر اٹھا کر اوپر دیکھا، اس پانچویں راکٹ کی کچھ کرچیاں اس کے بدن میں پروئی جا چکی تھی اور اسی لمحے آسمان کے اس ٹکڑے میں سے ایک پرندہ تیرتا گزر گیا..

شگاف کے مقام سے تین سال خوردہ شہتیر پانی میں آ گرے اور بڑبڑانے لگے.. وہ پہلی بار تہہ خانے کو اس کی مکمل جزیات کے ساتھ دیکھ سکتے تھے کہ اس میں راکٹوں کی آگ شب برات کرتی تھی، انار چھوٹتے تھے، پھلجھڑیاں چلتی تھیں اور ہوائیاں بلند ہوتی تھیں... ایک دیوالی تھی جس میں تہہ خانے کا یہ چھوٹا سا بنارس سینکڑوں چراغوں سے جھلملاتا تھا..

انہیں دھماکے تو سنائی ہی نہیں دے رہے تھے.. وہ صرف شب برات کی روشنیاں اپنے چہروں پر محسوس کرتے تھے اور دیوالی کے دیئے ان کے بدنوں کو روشن کرتے تھے..

انہوں نے پہلی بار اللہ بخش، عبدالوہاب اور ابو طالب کے مردہ چہرے دیکھے.. اور انہیں دیکھ کر آبدیدہ ہوئے۔ برف ہو چکے آنسوؤں میں کھو چکے یاروں کی دید نے حدّت بھر دی.. بس اتنی ہی حدت جتنی کہ ایک آنسو کو بہنے کے لیے درکار ہوتی ہے.. اگرچہ وہ ان کے چہرے بارود بھرے دھوئیں کی چلمن میں سے دیکھتے تھے.. خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں.. اللہ بخش.. عبدالوہاب اور ابو طالب.. خوب پردہ ہے..

جو بھی راکٹ سیڑھیوں سے فائر ہو کر نیچے آتا، اس کا کوئی خاص ہدف نہ ہوتا.. اگر وہ پانی کے اندر مار کرتا تو اس کی تہہ میں جو کچا فرش تھا، اسے ادھیڑ کر ایک گڑھا کھود کر ٹھنڈا ہو جاتا.. اور اگر وہ سیڑھیوں سے نیچے آ کر بالکل سامنے جاتا، پانیوں پر سے گزر جاتا تو اس کے آگے مٹی کی ایک دبیز دیوار ہوتی جسے وہ کوئی ضعف نہ پہنچا سکتا اور اس کے ساتھ ٹکرا کر پانی میں گر جاتا.. البتہ اس کے پھٹنے سے جو کرچیاں ایک گل رنگ انار کی مانند چھوٹتیں اور بکھرتیں، وہ ان چاروں کے جسموں میں کہیں نہ کہیں پیوست ہو جاتیں..

تہہ خانے کے پانی بارود کی آگ سے تلاطم میں تھے اور ان میں ایک خاص حدت جنم لے رہی تھی جو ان کے بدنوں کو راحت سے آشنا کر رہی تھی.. اور ان پانیوں میں ان کی اپنی غلاظت، گھوڑے کی لید اور اس کے پرخچے اور تین لاشوں کی بُو اتھل پتھل ہو رہی تھی..

وہ پانیوں کی اس اتھل پتھل میں ان مرغابیوں کی مانند حواس باختہ اور سناٹے میں تھے جن پر کسی محفوظ اور پُرسکون جھیل میں تیرتے ہوئے ناگہانی فائر کھل جاتا ہے..

اللہ بخش، عبدالوہاب اور ابوطالب ایک بے اختیار نڈھال حالت میں اپنی اپنی لاشوں کو بھی سنبھال نہیں پاتے تھے اور کبھی وہ مکمل طور پر غرق ہو جاتے تھے اور کبھی ان سے جا ٹکراتے تھے تو انہیں بھی اپنی مانند سرد، مردہ اور اکڑے ہوئے پاتے تھے۔ گھوڑے کی تھوتھنی حیرت میں ہچکولے کھاتی پھرتی تھی کہ یہ کیسا تلاطم ہے اور لاشوں سے اٹکتی تھی.. کچھ پرانی تھیں اور کچھ نئی..

یہ آگ تماشا چند لمحوں بعد ختم ہو گیا.

جیسے پانی تھم گئے تھے..

پانیوں میں حدت پیدا ہو چکی تھی اور ان کے اوپر دھواں معلّق تھا اور اس



سے اوپر شگاف میں سے قلعہ جنگی کے آسمان کا ایک ٹکڑا نظر آ رہا تھا اور وہاں دھوپ تھی..

وہ بوٹ اب سیڑھی سے ہٹ چکے تھے اور سایہ جا چکا تھا..

دھوپ اب بھی پہلی سیڑھی پر براجمان تھی.. لاتعلق اور روشن جیسے کچھ ہوا ہی نہیں..

چھت کے شگاف میں سے نظر آتے نیلے آسمان پر ایک اور پرندہ گزرا..

یہ ایک اور نہیں وہی پرندہ تھا جو پہلے بھی گزرا تھا اور جانی کو دکھائی دیا تھا..

تہہ خانے میں دھماکوں کی بوچھاڑ اور شب برات اور دیوالی کی چکاچوند کے بعد اتنی خاموشی ہوئی، اتنی تاریکی ہوئی کہ ناگوار لگنے لگی..

پانی جو ابھی ہلکی حدت میں تھے، دھیرے دھیرے سرد مہری کی جانب بہنے لگے..

دوپہر جو ڈھل چکی تھی، شام کی سیاہی میں گھلنے لگی..

چھت کے شگاف کے راستے پہلی بار شام آئی تو اس کی سرمئی آنکھوں نے دیکھا کہ تہہ خانے میں صرف ہاشم میر سلامت ہے..

سلامت سے مراد یہ ہے کہ وہ مکمل حالت میں تھا اگرچہ مردہ تھا...

مرتضیٰ بیگ اور گل شیر ولی بکھر چکے تھے..

بیگ کے بدن کا کوئی ایک حصہ.. کوئی ایک ہاتھ یا چوڑا سینہ بھی باقی نہیں بچا تھا.. وہ جیسے پانیوں میں تحلیل ہو چکا تھا..

البتہ گل شیر نسبتاً خوش نصیب رہا تھا کہ کم از کم اس کا سَر سلامت تھا..

دھڑ سے بچھڑا ہوا یہ سَر پانیوں میں ڈبکیاں کھاتا پھرتا تھا.. ڈیرے کے شیریں مالٹے کی مانند.. کوئی دیکھ تو نہیں رہا تھا لیکن اگر کوئی دیکھتا تو گل شیر کا سَر حیرت انگیز طور پر

بُدھا کے اس سر سے مشابہت رکھتا تھا جو قلعہ جنگی کے ایک گڑھے میں پڑا تھا.. اس کے چہرے پر ایک الوہی سکون تھا. گیان دھیان کی شانتی تھی.. آنکھیں نروان کے نشے میں بند تھیں.. بال سر پر بندھے ہوئے تھے اور وہ دیر کے شیریں مالٹے کی مانند ادھر ادھر ڈبکیاں کھاتا پھرتا تھا.. گندھارا کی مٹی نے اسے موت کے بعد اپنے ماضی کی جانب دھکیل دیا تھا..

اور گھوڑے کی تھوتھنی تھی جو پانیوں کی آخری ہلچل میں ڈولتی جھولتی جانی کے بدن سے جا لگی تھی اور مردہ ہونے کے باوجود جان گئی تھی کہ اسے شوٹ کرنے کے باوجود اسے چاہنے والے کے بدن میں ابھی تک حرارت موجود ہے.. وہ یکجا ہے اور زندہ ہے..

وہ پرندہ بھی اسی لیے لوٹ کر آیا تھا تاکہ نیچے قلعہ جنگی کے صحن میں جو شگاف تھا، اس میں جھانک کر دیکھ سکے کہ جس نے اسے آسمان پر تیرتے دیکھا تھا، وہ ابھی تک ہے یا نہیں.. اور وہ تھا..

پانی پھر سے سرد ہو چکے تھے..

بارود کی عطا کردہ عارضی حرارت ان میں سے زائل ہو چکی تھی..

البتہ ان پانیوں پر اب ایک میلہ لگا ہوا تھا.. میلے میں خوب رونق تھی..

اللہ بخش، وہاب، ابو طالب اور ہاشم میر بڑے فخر اور اطمینان سے ان پر تیرتے تھے کہ ان کے وجود سلامت تھے اور روزِ حشر ان کو سمیٹنے کی ضرورت پیش نہیں آنی تھی.. مرتضیٰ بیگ پانیوں میں یوں گھل مل گیا تھا کہ اسے اس روزِ آخر اکٹھا کرنے میں یقیناً بہت سی دشواری ہونی تھی اور ان میں گل شیر ولی کا سر ایک تماشائی کی مانند کبھی اسے دیکھتا تھا اور کبھی اسے اور پھر کبھی ڈوبتا تھا اور کبھی پانی کی سطح پر ابھر آتا تھا.. اس کا بقیہ دھڑ نہ بھی مجتمع کیا جا سکا تو کم از کم اس کا سر تو سلامت تھا..



گھوڑے کی تھوتھنی البتہ جانی کے ساتھ لگ کر ہچکولے کھاتی ہچکیاں لیتی تھی۔

رات ہو گئی تھی..

شام کے سرمئی قدم پچھلے پاؤں لوٹ گئے تھے اور ان کی جگہ رات کا سیاہ پوش اپنا لبادہ پھیلاتا تھا..

اوپر.. چھت کے شگاف میں سے قلعہ جنگی کے آسمان کے ایک مختصر ٹکڑے میں ستارے ٹانکے گئے تھے جو چاندنی کی ہلکی لو میں کم کم دکھائی دیتے تھے..

ان سب ستاروں کو گنا جا سکتا تھا... شگاف زیادہ بڑا نہیں تھا..

عبدالحمید جان واکر اس میلے کا واحد تماشائی تھا..

اس پر کئی روز کی بھوک... کہ اس نے اپنے پونی کو کھانے سے انکار کر دیا تھا اور پیاس بدن میں براجمان کرچیوں، ٹھہری ہوئی گولیوں .. زخموں .. ناسوروں.. کا سحر طاری ہو چکا تھا.. اس کے چوڑے شانوں پر آئے ہوئے غلیظ بال تیکھی سولوں کی مانند اکڑے ہوئے تھے... بے تحاشا بڑھی ہوئی داڑھی ٹانگوں میں لرزش آ جانے سے کبھی پانی کو جا چھوتی اور کبھی وہ ہڑبڑا کر.. لڑکھڑا کر پھر سے کھڑا ہو جاتا..

تہہ خانے کی چھت کے شگاف میں سے جو ستارے دکھائی دے رہے تھے، جانی کے دونوں بازو ان کی جانب اٹھے ہوئے تھے اور ان میں ایک کلاشنکوف جکڑی ہوئی تھی.. وہ چاہتا بھی تو اپنے بازو نیچے نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اتنا اکڑ چکا تھا اور چاہتا بھی تو اس کلاشنکوف سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے لوہے پر اسکی انگلیاں پگھل کر منجمد ہو چکی تھیں..

اسے اگر اسی حالت میں اٹھا کر کسی کلینک میں لے جایا جاتا تو وہ تکنیکی طور پر مر چکا تھا کہ اس میں کچھ بھی نہ دھڑکتا تھا... کچھ رواں نہ تھا، کچھ بہاؤ میں نہ تھا..

صرف اس کی آنکھیں بقیہ بدن سے الگ ہو کر زندہ تھیں اور دیکھتی تھیں اور ان کی پُتلیوں میں ابھی تک ایک پرندہ تیرتا تھا..

تہہ خانہ.. سیڑھیاں.. قلعہ جنگی کا کچا صحن سب خاموشی میں تھے..

راکٹ فائر کرنے والے سائے مطمئن ہو کر کب کے جا چکے تھے..

رات تھی..

ایک ایسی رات کتنی طویل ہو سکتی ہے جس میں ایک بدن تکنیکی طور پر مر چکا ہو اور صرف اس کی آنکھیں شگاف میں دمکتے چند ستاروں کو دیکھتی ہوں..

اسے اپنے ساتھیوں کے بکھر جانے کا، مر جانے کا چنداں قلق نہ تھا.. کوئی دکھ نہ تھا کہ اس کا پورا بدن حسیات سے عاری ہو کر مردہ ہو چکا تھا۔

تہہ خانے میں یہ رات اتنی ہی طویل تھی جتنی کہ ایک تکنیکی طور پر مردہ بدن محسوس کر سکتا ہے... یعنی کوئی بھی زندہ شخص چاہے وہ کینسر کے آخری مراحل میں اذیت سے تڑپتا ہو، یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ وہ رات کتنی طویل تھی..

گھوڑے کی تھوتھنی بہت الفت سے اس کی دائیں ٹانگ سے ٹکراتی تھی..

پانی..ایک تکنیکی طور پر مرے ہوئے شخص کے بدن کے لیے بھی بہت سرد تھے..

دھواں تحلیل ہو چکا تھا.. پانیوں کی اتھل پتھل ختم ہو چکی تھی اور اوپر ستارے تھے جو شگاف کو پُر کرتے تھے..

تصوّر کامل ہمیشہ ہار جاتا ہے..

ہاں ڈیڈی...

اور تم ہارنے کے لیے وہاں جانا چاہتے ہو؟

ہاں ڈیڈی...

آتش پرست کے سامنے مرتبان میں جلتی مقدّس آگ کا شعلہ تیز ہوا سے



بری طرح پھڑپھڑایا... یہ شعلہ بھی ایک زمانے میں ایک تصوّر کامل تھا جو اب متروک ہو چکا تھا.. بیشتر خداؤں کی مانند... بامیان کے بدھ کی مانند..

یہ رات اس آتش پرست بوڑھے کے لیے بھی بے حد طویل ہو رہی تھی جس نے اپنے شعلے کو زندہ رکھنے کی خاطر لاکھوں راتیں گزار دی تھیں..

کیا ایک ہزار برس بعد قلعہ جنگی کے اس تب تک زمین میں دفن ہو چکے تہہ خانے کے اندر جو ہڈیاں ہوں گی، ان کی بازیابی کے لیے بھی کسی کو خواب آئے گا کہ ہم یہاں دفن ہیں اور وہ ہمیں کھود نکالے گا اور اس تہہ خانے کے عین اوپر ایک اور مزار شریف وجود میں آئے گا... یا تب تک یہ جو کچھ ہے، یہ بھی متروک ہو چکا ہو گا..

رات ازل سے شروع ہوئی تھی اور جانے کب اس کا ابد آنا تھا، یہ اتنی طویل ہو رہی تھی..

نیلگوں شیشہ پانیوں میں.. جھیل بندِ امیر کے پانیوں میں وہ سب کے سب من چلی کھلنڈری غل مچاتی ڈولفنوں کی مانند تیرتے پھرتے تھے.. ان کے بدن نئے نکور تھے.. پھوٹتی کونپلوں کی طرح.. شفاف تھے، شرمیلی کنواریوں کی طرح اور بے داغ تھے نبیوں کے لبادوں کی طرح ان پر کوئی زخم نہ تھا.. کوئی ناسور، کوئی گھاؤ نہ تھا، وہ ابھی ابھی ماں کی کوکھ میں سے نکلے تھے اور تیرتے پھرتے تھے..

اپنے صحراؤں اور اپنی کربلاؤں کی پیاس بجھاتا عبدالوہاب تھا۔ جھیل میں بار بار ڈبکیاں لگاتا، اس کے پانیوں کو اپنے سوکھے حلق میں اتارتا، بارش میں نہاتے بچّے کی مانند شور مچاتا عبدالوہاب تھا تیرتا پھرتا..

کنویں کی تہہ سے برآمد ہونے والے بونے کو دیکھ کر خوشی سے "ہو ہو" کرتا اللہ بخش تھا اور وہ تیراکی نہیں جانتا تھا.. جوہڑوں میں پلنے والا اتنی شیشہ جھیل کے پانیوں میں ڈبکیاں کھاتا ہاتھ پاؤں مارتا اللہ بخش تھا۔

چی چی اپنے گاؤں کے چولہوں میں سے اٹھنے والے دھوئیں کے عقب میں ایک چٹان کے جھرنوں میں تیرتے عقاب کی مانند اس جھیل میں پھڑپھڑاتا اور خوشی سے لبریز ہوتا تھا..

گل شیر ولی زندگی میں پہلی بار آزاد ہوا تھا.. اس کی پشت پر کوئی نواب سوار نہیں تھا اور اسے ایک گھوڑے کی مانند نہیں ہانکتا تھا اور نیلو نیل شفاف پانیوں میں تیرتے ہوئے اس کے آس پاس مالٹوں کے باغ مہک دیتے تھے۔

ہاشم میر کے لیے اس کی ماں گرم دودھ کا گلاس لے کر آئی تھی اور وہ پانیوں میں چھینٹے اڑاتا اسے کہتا کہ.. بس تھوڑی دیر اور ممی.. بس تھوڑی دیر..

جھیل بند امیر کے پانیوں میں مرتضیٰ بیگ کے باپ کے گناہ دھل رہے تھے..

پھر اس نے اپنے آپ کو دیکھا..

ایک تکنیکی طور پر مرے ہوئے جان واکر نے اپنے آپ کو دیکھا..

وہ کیسے ان میں ہو سکتا تھا کہ وہ تو وہاں جا چکے تھے اور وہ شائد ابھی تک یہاں تھا.. لیکن اس نے اپنے آپ کو اپنی نظروں سے دیکھا کہ وہ بھی جھیل بندِ امیر کے پانیوں پر اپنے براؤنی پر سوار چلا جاتا ہے.. براؤنی کے پاؤں پانیوں میں نہیں ڈوبتے، ڈوبنے سے پہلے ہی اٹھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ وہ اتنا برق رفتار ہے..

ایک فرق تھا..

اس کے ساتھیوں میں سے کوئی بھی اس کی جانب دھیان نہیں کرتا تھا۔ اگر کرتا تھا تو اسے نہیں دیکھتا تھا..

وہ آپس میں چہلیں کرتے تھے لیکن اس کے وجود سے بے خبر تھے..

گھوڑا مجتمع ہو چکا تھا.. اس کی پسلیوں کے گوشت میں سے جتنے پارچے



تراش کر نکلے گئے تھے، وہ سب کے سب اپنی جگہ پر موجود اس کے بدن کو مکمل کرتے تھے.. اس کی تھوتھنی پھر سے جُڑ گئی تھی اور اس کے نتھنے پھڑکتے اور ہنہناتے تھے.. جانی نے محسوس کیا کہ اس کے آس پاس صرف اس کے سُموں کی آواز نہیں جو پانی پر چھینٹے اڑاتے جاتے تھے بلکہ ایک پھڑپھڑاہٹ بھی تھی جیسے ایک پرندے کے پروں میں سے دورانِ پرواز سنائی دیتی ہے.. اس کی آنکھوں کی پُتلیوں میں جو پرندہ تھا، شائد وہ باہر آ گیا تھا.. اس نے اپنے پَر.. سفید براق پَر.. گھوڑے کو عطا کر دیئے تھے اور وہ جھیل کے پانیوں سے اٹھ کر ان سفید براق پروں کو پھڑپھڑاتا عرشوں کی جانب پرواز کر رہا تھا..

گھوڑے کی تھوتھنی اب بھی اس کی دائیں ٹانگ کو چھوتی تہہ خانے کے پانیوں میں ہچکولے کھاتی تھی..

یہ تھوتھنی ابھی ابھی عرشوں کی مسافر تھی.. اور ابھی تہہ خانے کے پانیوں میں ڈبکیاں کھاتی تھی..

رات ختم ہونے میں نہ آتی تھی..

کسی بھی شے یا جذبے کی مدت کا تعین آغاز اور انجام کے درمیان پھیلے فاصلوں سے ہوتا ہے.. اور یہ تعین حسّیات پر منحصر ہوتا ہے.. اگر کوئی حِس نہ ہو، بدن مردہ ہو چکا ہو تو پھر یہ تعین ایک موت کی مانند ہوتا ہے جس کے فاصلے روز حشر تک جاتے ہیں۔

اسی طور اس رات کے خاتمے کا تعین نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ ایک ایسی ہی لامحدود رات تھی۔

لیکن صرف جانی کے بدن کے لیے..

قدرت کا نظام قلعہ جنگی کے تہہ خانے میں تکنیکی طور پر مردہ ہو چکے ایک شخص کے لیے تو نہیں رکتا.. بے شک اس کے آس پاس کچھ ساتھیوں کی

لاشیں ہوں.. کچھ پانیوں میں تحلیل ہو چکے ہوں اور گھوڑے کی ایک تھوتھنی ہو جو ابھی تک اپنے گمان میں عرش پر تھی.. یہ نظام تو نہیں رکتا، جاری رہتا ہے۔ اسی لیے تہہ خانے کی چھت کے شگاف میں سے دکھائی دینے والے ٹمٹماتے ستاروں کی لو مدھم ہونے لگی.. وہ معدوم ہونے لگے.. روشنی کے آگے ہتھیار ڈال کر پسپا ہونے لگے اور پھر معدوم ہو گئے..

ایک ہلکی روشنی.. ایک دھندلی سویر کی روشنی آسمان کے اس ٹکڑے میں سے در آئی.. جو تہہ خانے کے واحد مکین کو دکھائی دے رہا تھا اور پھر یوں لگا جیسے وہ روشنی اپنے آسمان کو ترک کر کے تہہ خانے کی سیڑھیوں پر سے اترتی ہے.. اس شگاف کے راستے داخل ہوتی ہے اور پھر ہر سو چکا چوند ہو گئی..

آتشیں وجود کی غیر موجودگی میں بھی ہر سو روشنی ہو گئی۔

اور آغاز میں ہر سو پانیوں پر دُھند تیرتی تھی

اور تب خدا نے کہا کہ روشنی ہو جا..

تو ہر سُو روشنی ہو گئی..

اوپر قلعہ جنگی کے صحن میں کچھ چہل پہل تھی..

کبھی کبھی کوئی چہرہ جھک کر اس شگاف میں سے نیچے جھانکتا اور ناک پر رومال رکھ کر پرے ہو جاتا..

ریڈ کراس کے کارکن لاشیں اٹھا رہے تھے..

شگاف میں سے دکھائی دینے والے آسمان کے ٹکڑے میں قلعے کے صحن میں سے لاشیں گھسیٹنے اور جمع کرنے سے کچھ دھول اٹھ رہی تھی..

پھر یکدم اوپر چپ کا سناٹا اتر آیا..

دوپہر ڈھلنے لگی..

پھر کوئی ایک لمحہ ایک ساعت ایسی آئی جو درج تھی اور اس میں قلعہ جنگی



کے صحن میں جو شگاف تھا۔ اس میں سے کسی نے جھانکا اور کہا۔ "نیچے تہہ خانے میں بھی کچھ لاشیں ہوں گی، انہیں اٹھانا چاہیے.."

"ادھر سے سیڑھیاں اترتی ہیں.. چلو" کسی اور نے کہا..

قدموں کی دستک اس تکنیکی طور پر مردہ بدن کے کانوں میں آئی..

پہلی سیڑھی پر کچھ پاؤں آئے.. ان میں کچھ فوجی بوٹ تھے، کچھ جاگرز اور کچھ چپلیں..

وہ بے خطر نیچے اترتے تھے۔ جب عبدالحمید جان واکر کے مر چکے منجمد بدن کی آنکھوں کے علاوہ وہ ایک انگلی بھی زندہ ہو گئی جو لبلبی پر تھی، اسے دبانے میں پہروں لگ گئے، بالآخر وہ دب گئی..

گولیوں کی باڑ نے سیڑھیوں کا پلستر ادھیڑ دیا اور ان میں سے دھول بلند ہوئی اور اس دھول میں کوئی زخمی ہو کر گرا اور لڑھکتا ہوا نیچے پانی میں آ گرا..

"شِٹ.." کسی نے امریکی لہجے میں تھوکا۔ "ادھر تو اب بھی کوئی ہے.."

"ہاں... میں ہوں... ڈونٹ کم ڈاؤن آر آئی وِل شوٹ..."

"کرائسٹ..." اسی لہجے میں ایک بے یقین حیرت کا خوف اُبھرا۔ "یہ تو ہو نہیں سکتا لیکن نیچے.... ہم میں سے کوئی ہے۔"

"نو.... آئی ایم ناٹ وَن آف یو... میں تم میں سے نہیں ہوں۔"

اور اسی ساعت میں جب اس نے یہ کہا کہ میں تم میں سے نہیں ہوں، عبدالحمید جان واکر کی انگلی پھر سے مردہ ہو گئی... اس کی آنکھیں بھی مردہ ہو گئیں لیکن انہوں نے بینائی کھو دینے سے قبل شگاف میں سے نظر آتے آسمان پر ایک پرندہ تیرتے دیکھا اور پھر وہ گرا اور اسی پانی میں ڈوبنے لگا جس میں اس کے ساتھیوں کے لاشے اور غلاظت اور بارود کی بُو تیرتی تھی... ڈوبتے ہوئے اس نے گھوڑے کی تھوتھنی کو ایک تھپکی دینے کی سعی کی.... براوُنی!

بلخ کے کھنڈروں میں براجمان آتش پرست کی آگ بھڑکی اور بجھ گئی...

کیا ایک ہزار برس بعد قلعہ جنگی کے اس تب تک زمین میں دفن ہو چکے تہہ خانے کے اندر جو ہڈیاں ہوں گی، ان کی بازیابی کے لیے بھی کسی کو خواب آئے گا کہ ہم یہاں دفن ہیں اور وہ ہمیں کھود نکالے گا اور اسی تہہ خانے کے اوپر ایک اور مزار شریف وجود میں آئے گا... یا تب تک یہ جو کچھ ہے، یہ بھی متروک ہو چکا ہو گا..

